

## ترکی کا مخدوش اسلامی تجربہ (مغرب کی حمایت اور اسلام و سیکولرزم کا اشتراک) اور پاکستان میں اس کا نفوذ

ترکی میں حکمران جماعت (جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی) کی کارکردگی بظاہر ایک کامیاب تجربہ نظر آتی ہے جس کے چار بڑے مظاہر ہیں:

۱- اس نے ملک کو معاشی اور سیاسی استحکام دیا ہے اور گڈ گورنس کی اچھی مثال پیش کی ہے۔

۲- اس نے باقاعدگی سے منصفانہ انتخابات کروائے ہیں اور عوامی حمایت سے جیتے ہیں۔ یوں ملک میں جمہوریت مستحکم ہوئی ہے، فوج کے عمل دخل کا تقریباً خاتمہ ہو گیا ہے اور فوجی جرنیلوں کو عدالتوں سے سزائیں ملی ہیں۔

۳- اس نے ملک میں اسلامی اقدار کی حمایت کی ہے اور معاشرے کو مغربیت سے اسلامیت کی طرف لانے کا سفر جاری رکھا ہے۔

۴- اس نے فلسطین کی عملی حمایت کر کے مسلم امہ کے کاز کو تقویت پہنچائی ہے۔

اتنی ساری کامیابیوں کی وجہ سے ترکی کا ایک اچھا امیج عالم اسلام اور خصوصاً پاکستان میں ابھر کر سامنے آیا ہے کیوں کہ ہمارے اپنے حالات نالائق اور کرپٹ سیاسی قیادت کی وجہ سے دگرگوں ہیں اور لوگ ترکی کو ایک اچھا ماڈل سمجھنے لگے ہیں۔

ترکی قیادت کی ان کامیابیوں پر ہم اپنے ترک بھائیوں کو مبارکباد پیش کرتے ہیں اور پاکستانی بھائیوں سے کہتے ہیں کہ ترکی سے سبق سیکھو اور اپنے حالات درست کرو۔ تاہم اس ثناخوانی کے بعد ترکی کے اسلامی اور جمہوری تجربے کے بعض خطرناک یا کم از کم مخدوش پہلوؤں کی طرف اپنے قارئین کی توجہ بھی مبذول کرانا چاہتے ہیں۔

چند ماہ پہلے جب ہم ایران میں ایک علمی کانفرنس میں شرکت کے لیے گئے تھے تو وہاں ہماری ملاقات نجم الدین اربکان کی رفاہ پارٹی کے بعض لوگوں سے ہوئی تھی اور حال ہی میں ہماری ملاقات نوری تحریک کے بعض لوگوں سے ہوئی ہے۔ ترکی کی ان دونوں اسلامی تحریکوں کے لوگ طیب اردگان کی جسٹس

اینڈ ڈولپمنٹ پارٹی سے ناخوش ہیں اور ان کی برائے نام اور سطحی اسلامی پالیسیوں سے نالاں ہیں۔ پھر یہ بات بھی پاکستانی پریس میں آچکی ہے کہ طیب اردگان جب پچھلے دنوں قاہرہ گئے تو انہوں نے صدر مرسی کو مشورہ دیا کہ وہ اسلامی پالیسیوں کے حوالے سے ہاتھ ذرا ہولارکھیں اور سیکولرزم کو کلیتاً ترک نہ کریں۔ ظاہر ہے صدر مرسی نے، جو اخوان کے منجھے ہوئے کارکن ہیں، اس مشورے پر کان نہیں دھرے۔

اس کے ساتھ کچھ اور حقائق بھی پیش نظر رہنے چاہئیں۔ فکری سطح پر ترکی کی حکمران جماعت کو تقویت بلکہ مہینہ شیخ فتح اللہ گولن کی تعلیمی و اصلاحی تحریک سے ملی ہے جو امریکہ میں مقیم ہیں اور وہیں سے تحریک کی قیادت کر رہے ہیں۔ ان کی تحریک کو اگر ہم مغرب زدہ یا مغرب پرست نہ بھی کہیں تو کم از کم یہ بات اطمینان سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ مغربی فکر و تہذیب کی بالادستی کو قبول کرتے ہیں، اسے چیلنج نہیں کرتے اور اسے غیر اسلامی قرار دے کر رد نہیں کرتے بلکہ اسلام کی ایسی تعبیر کرتے ہیں جو مغربیت کو فکری سطح پر اور کارکنوں کی زندگی میں عملی طور پر (بطور لائف سٹائل) قابل قبول بناتی ہے ☆۔

ترکی میں فکری انحراف کی دوسری بڑی مثال یہ ہے کہ وہاں کا مذہبی امور کا ڈائریکٹوریٹ ترکی یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے اسلامیات کے چیدہ پروفیسروں سے مل کر حدیث رسول ﷺ کے ذخیرے کی چھان پھٹک اور تدوین نو ”عصری حالات اور تقاضوں کے مطابق“ کر رہا ہے۔ اس کے نتیجے میں اس ذخیرہ حدیث کا، جو ہمارا قیمتی ورثہ بلکہ ہمارے دین کا قرآن کے ساتھ بنیادی ماخذ ہے، جو حشر ہونے والا ہے، اس کا تصور ابھی سے کیا جاسکتا ہے۔

بین الاقوامی اور ملکی سطح پر اس کے اثرات یہ ہیں کہ ترکی نیٹو اور امریکہ کی ان افواج کا ایک حصہ ہے جو افغانستان میں طالبان کو کچلنے میں مصروف ہیں۔ وہ یورپی یونین کی رکنیت کے لیے یورپی ممالک کی حمایت کا خواہاں ہے اور ان کے مطالبے پر ملک کے اسلامی امیج کو نرم (Soft) اور دھیمے سُر (Low profile) میں رکھنے پر تیار ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ حال ہی میں اس نے نیٹو کے میزائل ڈے شام کی سرحد کے ساتھ اپنے علاقے میں قائم کر لیے ہیں تاکہ بوقت ضرورت نیٹو افواج شام میں مسلح مداخلت کر سکیں۔ اگرچہ ایران کا رویہ بھی شام کے شیعہ آمر اور ملک کی اکثریتی اہل سنت آبادی پر مظالم کی انتہا کرنے والے اور اپنا اقتدار ہر قیمت پر بچانے میں کوشاں بشار الاسد کی حمایت کرنے کی وجہ سے عالم اسلام اور پاکستان

☆ جب کہ درحقیقت ایسا نہیں ہے اور مغرب کی فکر و تہذیب اسلامی اصولوں کے رد پر مبنی ہے اور اہل مغرب کا رویہ بلا شک و شبہ اسلام اور مسلم دشمنی اور عالم اسلام کو اپنے پاؤں تلے دبا کر رکھنے کا ہے جو امت کے لیے ناقابل قبول ہے۔

میں ناپسند کیا جا رہا ہے تاہم اس کی دوسری انتہا یہ ہے کہ ترکی نیٹو اور امریکی فوج کو شام میں مسلح مداخلت کے لیے سہولتیں مہیا کر رہا ہے اور وہ کسی وقت بھی شام میں داخل ہو کر بشار حکومت کا تختہ الٹ سکتی ہیں۔ اس میں جو چیز کاوٹ بنی ہوئی ہے وہ ایران کی حمایت میں روس اور چین کا امریکی و یورپی موقف کی مخالفت کا رویہ ہے ورنہ عراق اور لیبیا کی طرح شام کب کا امریکی و یورپی فوجوں کے ہاتھوں فتح ہو چکا ہوتا۔

ہماری بات کا خلاصہ یہ ہے کہ ترکی کے بعض اچھے اقدامات کے باوجود وہاں کی حکمران جماعت کا اسلامی لحاظ سے رویہ مخدوش بلکہ خطرناک محسوس ہوتا ہے۔ اسلام اور سیکولرزم کو یکجا کر کے قبول کرنا، اسلام کے مقابلے میں مغربی فکر و تہذیب کی بالادستی کو چیلنج نہ کرنا، ذخیرہ حدیث کو جدیدیت کے رنگ میں ڈھال کر پیش کرنا اور عالم اسلام پر مغرب کے استیلاء میں اس کا ساتھ دینا ایسے امور نہیں جن سے آنکھیں بند کر لی جائیں یا داد و تحسین کے ڈونگرے برسائے جائیں بلکہ ان پر فکر مندی کی ضرورت ہے۔ اگر کسی طرح ممکن ہو تو اپنے خدشات ترک حکمرانوں تک پہنچانے چاہئیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ پاکستان میں اس جیسے حالات پیدا ہونے میں ابھی سے مزاحمت کا مائنڈ سیٹ بنانے کی ضرورت ہے کیونکہ پاکستان میں اس نقطہ نظر کے نفوذ کے لیے مغرب متعدد اقدامات کر رہا ہے جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

مغرب پاکستان میں ایسے علماء و سکالرز کو مسلسل آگے لانے کی کوشش کر رہا ہے جو مغرب کی اصطلاح میں اسلام کا ”سافٹ امیج“ پیش کریں مطلب یہ کہ جہاد کی حیلے بہانے مخالفت کریں، قوانین شریعت کے نفاذ خصوصاً نفاذ حدود اور نفاذ قانون تو بہن رسالت کی حکمت سے اور دبے لفظوں میں مخالفت کریں اور تعلیم و میڈیا کے ذریعے اسلام کی ایسی تصویر پیش کریں جس میں مغربی فکر و تہذیب کو رد نہ کیا جائے بلکہ سیکولرزم کو بالواسطہ طور پر قبول کر لیا جائے۔ یہ کام پہلے پرویز صاحب کیا کرتے تھے، پھر مشرف دور میں جاوید غامدی صاحب (اور ان کی ٹیم جیسے عمار ناصر صاحب، خورشید ندیم صاحب، ڈاکٹر خالد ظہیر صاحب وغیرہ) کو میدان میں لایا گیا اور اب زرداری صاحب کے دور حکومت میں مولانا طاہر القادری صاحب کو پروموٹ کیا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی روایتی علماء اور دینی جماعتوں کو بھی بالواسطہ طور پر استعمال کیا جا رہا ہے مثلاً جمعیت علماء اسلام کے (مولانا فضل الرحمن) پیپلز پارٹی کی حمایت کرتے اور اس کی حکومت کا حصہ رہے ہیں، اس کے باوجود کہ زرداری حکومت کا امریکہ و یورپ کا گماشتہ ہونا ظاہر و باہر ہے۔ اسی طرح جماعت اسلامی اگرچہ سیاسی طور پر مغرب مخالف ہے لیکن اس کے ہزاروں تعلیمی ادارے

دھڑلے سے مغربی فکر و تہذیب اور اس کے اصول و اقدار کو پروموٹ کر رہے ہیں جہاں تعلیم مخلوط ہے، انگریزی کا غلبہ ہے، غیر ملکی اور غیر مسلم مصنفین کی (آکسفورڈ کی) کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، مغربی ممالک کے (اواورائے لیول) کے امتحانات دلوائے جاتے ہیں..... وغیرہ۔ جہاں تک حکومت پاکستان کی سیاسی اور عسکری پالیسیوں کا تعلق ہے وہ علی الاعلان امریکی و یورپی غلام قبول کرنے کے مترادف ہیں۔ تعلیم اور میڈیا جیسے ذہن سازی کے پاکستانی اداروں کو مغرب کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ جیسے چاہیں ان سے فساد قلب و نظر کے لیے کام لیں اور اسلامی اخلاق و کردار کا جنازہ نکالیں اور علماء کرام اور دینی جماعتیں سب کچھ ہوتا دیکھتی ہیں اور اس سے مس نہیں ہوتیں اور پاکستانی معاشرہ مغربیت کی (سیکولرزم، مغربی جمہوریت، سرمایہ دارانہ معیشت وغیرہ) کی راہ پر بگڑت دوڑتا چلا جا رہا ہے اور کوئی نہیں ہے، جو اس وحشت زدہ گھوڑے کی لگامیں پکڑے اور اسے روکے۔

ہم پاکستان کے اصحاب فکر و نظر، اہل دانش، علماء کرام، صحیح الفکر سیاست دانوں اور رسول سوسائٹی کے دردمند افراد سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ ہماری گزارشات پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں اور اپنے اپنے دائرہ کار میں ان حالات کی اصلاح کی طرف لوگوں کو توجہ دلائیں۔

## شمع جلتی رہے

البرہان محض ایک جریدہ نہیں ایک مشن ہے۔ اگر آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی ہے تو کوشش کیجیے کہ یہ شمع جلتی رہے اور یہ شمع تبھی جلتی رہے گی جب آپ اس میں اپنے حصے کا تیل ڈالتے رہیں گے۔ خود بھی البرہان کے خریدار بننے اور دوسروں کو بھی بنائیے۔

زراعت سالانہ 400 روپے تاحیات 5000 روپے

دینی مدارس اور یونیورسٹی طلبہ و طالبات کے لیے 250 روپے سالانہ

نام..... پتہ.....

فون.....

چیک اور منی آرڈر بنام تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ 369-B، فیصل ٹاؤن، لاہور بھجوائیے

ٹرسٹ کو دیے جانے والے عطیات ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں

## دینی مدارس کا نصاب کیسا ہونا چاہیے؟

البرہان شمارہ دسمبر ۲۰۱۲ء میں ہمارے مضمون 'عصر حاضر میں ایک دینی مدرسہ کس طرح کا ہونا چاہیے؟' کے رد عمل میں ہمیں ایک مولانا صاحب کا خط موصول ہوا ہے جنہوں نے اپنا نام لکھنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ فرماتے ہیں:

”تقسیم کا ایک فطری قاعدہ ہے، جو تعلیم کے میدان میں بھی چلتا ہے۔ آج ہمارے کالجوں یونیورسٹیوں میں مختلف مضامین کے مختلف شعبے ہیں، جن کے لیے میٹرک کے بعد ایک طالب علم کو اختیار دیا جاتا ہے کہ اپنے ذوق اور میلان کے مطابق کسی شعبے کو اختیار کرے۔

اگر وہ میڈیکل میں جانا چاہتا ہے تو اسے اختیار ہے کہ وہ میڈیکل کالج میں داخلہ لے کر اچھا ڈاکٹر بنے اور مریضوں کی خدمت کرے۔ میڈیکل کالج کے پرنسپل کو اگر کوئی شخص یہ کہے کہ آپ کالج کے نصاب میں سائنس، لاء اور انجینئرنگ کے مضامین بھی داخل کر دیں تو وہ ان سے یہی کہیں گے کہ جناب ہم نے یہ کالج اس لیے قائم کیا ہے کہ اچھے ڈاکٹر پیدا ہوں اس لیے نہیں قائم کیا کہ ہم بیک وقت ڈاکٹر، انجینئر اور سائنسدان پیدا کریں گے اور یہی معقول جواب ہے۔

اسی قاعدہ کی روشنی میں میٹرک کے بعد آپ ایک طالب علم کو یہ حق کیوں نہیں دیتے کہ وہ اپنے لیے علم دین کا شعبہ اختیار کر کے ایک اچھا عالم بنے؟ اور اچھا عالم بننے کے لیے ایسے نصاب کی ضرورت ہے جو اسے دین کا فقیہ بنائے۔

اب اگر اس نصاب میں عصری علوم بھی شامل کر لیے جائیں جن کے لیے کالج اور یونیورسٹیاں قائم ہیں اور جن پر قوم کا خزانہ خرچ ہو رہا ہے تو اس کچھڑی سے نہ تو وہ عالم بنے گا اور نہ دوسرے فن کا ماہر، چنانچہ متحدہ ہندوستان میں یہ تجربہ ناکام ہوا۔ پاکستان میں بہاولپور اسلامی یونیورسٹی کا تجربہ ناکام ہوا۔ بعض شخصی تجربے ناکام ہوئے، قریبی دور میں ماڈل دینی مدارس کا تجربہ بھی طرح طرح ناکام ہوا۔ اب آپ گھر بیٹھے بیٹھے شیخ چلی کی طرح ایک مفروضہ نصاب بنا رہے ہیں اور مطالبہ کر رہے ہیں کہ آؤ ہم سے سیکھو، نہ آپ کو تجربہ اور نہ آپ عالم۔ فوا عجبا!

اس کے باوجود اگر آپ کو شوق ہے تو خود ایک ایسا معیاری ادارہ قائم کرتے اور علاقے تیار کرتے اور پھر دوسروں کو دعوت دیتے کہ آؤ آپ بھی ایسی درسگاہیں بناؤ۔ مدارس کے نصاب میں مفید اضافہ کے لیے مستقل ایک کمیٹی ہے جو نصاب کمیٹی کے نام سے مشہور ہے اور وہ نصاب میں مفید اضافے کرتی رہتی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم میں سے ہر ایک کو اسلام کے دائرہ میں رہتے ہوئے خدمتِ دین کی توفیق دے۔

والسلام،

### ایک مخلص

ہم البرہان میں دینی مدارس کے نظامِ تعلیم کے حوالے سے لکھتے رہتے ہیں اور اس کے علاوہ بھی اس موضوع پر ہماری کئی طویل اور مختصر تحریریں موجود ہیں لیکن محسوس ہوتا ہے کہ مولانا محترم ہمارے موقف کی تفصیل اور اس کے دلائل سے زیادہ واقف نہیں ہیں۔ اب اس کا ایک حل تو یہ ہو سکتا ہے کہ ہم مولانا محترم کو ان کے موقف کی خامی کا احساس دلانے کے لیے براہ راست اپنے دلائل کا اعادہ کریں اور یہ بتائیں کہ اسلام کا تصور علم اور تصور تعلیم کیا ہے اور وہ کیسا فرد اور معاشرہ تشکیل دینا چاہتا ہے؟ ماضی میں امت کا نظامِ تعلیم اور اس کے تعلیمی نظام کا نصاب کیسا رہا ہے اور دو تین صدیاں پیشتر مسلم معاشرے پر مغربی قوموں کے استیلاء اور ان کے تہذیبی غلبے نے نظامِ تعلیم میں کیا جوہری تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں اور یہ کہ دینی مدارس اور عصری تعلیم کی موجودہ ثنویت مغرب کے مذکورہ تہذیبی غلبے کے رد عمل اور اس سے مرعوبیت کا نتیجہ ہے اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا قاسم نانوتویؒ، مولانا محمد علی موگیلریؒ، علامہ شبلیؒ، سید سلیمان ندویؒ اور خود یوہند سے مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور مولانا مناظر احسن گیلانیؒ وغیرہم نے اس تعلیمی ثنویت کو غلط سمجھتے ہوئے اس سے نکلنے کے لیے کیا سوچا اور کیا اقدامات کیے اور مولانا محترم کی خدمت میں یہ بھی عرض کریں کہ تخصّص کا وہ اسلوب جو مغرب کے زیر اثر ہمارے تعلیمی ڈھانچے میں موجود ہے وہ اسلامی لحاظ سے کیوں غلط ہے اور بالفرض اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ دینی مدارس دینی تعلیم کے تخصّصی ادارے ہیں تو بھی ان کا موجودہ نصاب کس طرح ناقص ہے؟

ایک طریقہ تو یہ ہو سکتا ہے کہ ہم یہ ساری معروضات محترم مولانا اور ان کی طرح سے سوچنے والے دیگر حضرات کے سامنے ادب سے پیش کریں اور دوسرا طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ جن سوالات پر غور

کر کے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہمارے دینی مدارس کا موجودہ نصاب ناقص اور محتاج نظر ثانی ہے، وہ سوالات ہم محترم مولانا صاحب کے سامنے رکھ دیں اور ان سے درخواست کریں کہ وہ بھی ان سوالات پر غور فرمائیں اور اپنے نتائج فکر سے ہمیں آگاہ فرمائیں۔

محترم مولانا صاحب کو ہم یقین دلاتے ہیں کہ نہ تو ہم ماڈرنسٹ اور جدیدیت پسند ہیں اور اپنے تجدیدی بناء پر مدارس میں تبدیلی چاہتے ہیں اور نہ ہم مدارس کے بدخواہ ہیں کہ مدارس پر تنقید اور ان کی ہوا خیزی ہمارے پیش نظر ہو بلکہ ہم تو مدارس کے حامی اور خیر خواہ ہیں اور انہیں معاشرے میں مزید موثر کردار ادا کرتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں لہذا اگر مولانا محترم کے جوابات سے ہمارے موقف کی غلطی ہم پر واضح ہوگئی تو ہم ان شاء اللہ اپنے موقف سے دست بردار ہو جائیں گے۔ ہمارے سوالات یہ ہیں:

سوال ۱: کیا قرآن و سنت میں دین و دنیا اور دنیا و آخرت کی تفریق موجود ہے؟ کیا نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام کی جس طرح تربیت فرمائی تھی اور جس طرح کے آدمی تیار کیے تھے کیا وہ آج کل کی طرح کے محض مذہبی آدمی تھے اور ریاست و معاشرہ چلانے کی تعلیم و تربیت ان کو نہ دی گئی تھی؟

سوال ۲: پچھلے بارہ سو سال میں (یعنی صدر اول سے لے کر اہل مغرب کے مسلم ممالک پر استیلاء سے پہلے) مسلمانوں کا نظام تعلیم وحدت پر مبنی تھا یا نہیں؟ یعنی کیا ان کے ہاں دینی و دنیوی تعلیم کی ثنویت موجود تھی؟ کیا علماء کرام دنیوی علوم سے نابلد ہوتے تھے اور کیا عام مسلمان ایسی تعلیم و تربیت حاصل کرتے تھے دینی تعلیم جس کا اہم اور موثر جزو نہ ہوتی تھی؟

سوال ۳: مسلم ریاست کو ماضی میں کارکن کہاں سے ملتے تھے؟ اور جن مدارس و جامعات سے وہ کارکن آتے تھے انہیں کون چلاتا تھا؟

سوال ۴: پاکستان کے قیام کے بعد حالات میں یہ بنیادی تبدیلی آئی ہے یا نہیں کہ پہلے ہم دارالکفر میں رہتے تھے اور اب دارالاسلام میں ہیں؟ کیا دونوں میں نظام تعلیم ایک جیسا ہونا چاہیے؟ اور کیا دونوں کی حکومتوں کے ساتھ علماء کا رویہ ایک جیسا ہونا چاہیے؟

سوال ۵: کیا آپ کے نزدیک مغرب کا تخصص (سپیشلائزیشن) کا یہ تصور صحیح ہے جس میں مذہب ایک مضمون ہے جس کا باقی سارے علوم و فنون سے کوئی تعلق نہیں ہوتا؟

سوال ۶: کیا موجودہ مدارس کا نصاب تعلیم و تربیت ایسا ہے کہ ان کے فضلاء موجودہ معاشرتی ادارے اور ریاست چلا سکیں اور ان کے مسائل حل کر سکیں؟ اور کیا آپ یہی اسلوب جاری رکھنا چاہتے

ہیں کہ علماء مساجد و مدارس سنبھالیں اور معاشرہ و ریاست کو ان تعلیمی اداروں کے فاضلین چلائیں جو مغرب زدہ ہیں اور جہاں اسلامی تعلیم و تربیت کا نظام ناقص ہے۔ لگے ہاتھوں مولانا صاحب یہ بھی فرمادیں کہ جن جدید تعلیمی اداروں سے کروڑوں مسلمان بچے فارغ التحصیل ہو کر نکل رہے ہیں اور معاشرہ و ریاست کو غیر اسلامی انداز میں چلا رہے ہیں، اگر حکومت ان کی اصلاح نہیں کرتی تو اس ضمن میں علماء کرام کی کیا ذمہ داری ہے؟

سوال ۷ : کیا مغربی فکر و تہذیب اور اس کے علمبردار ممالک اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں یا نہیں؟ کیا عصر حاضر کے علماء کرام کے سامنے اس طحانہ مغربی فکر و تہذیب اور مسلم معاشرے پر اس کے غیر اسلامی اثرات سے نمٹنے کا چیلنج موجود ہے یا نہیں؟ اس چیلنج سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہمارے دینی مدارس کی پالیسی کیا ہے؟

ہم مولانا محترم سے درخواست کرتے ہیں کہ ان سوالات کے جوابات وہ ہمیں عنایت فرمائیں، ہم انہیں البرہان میں شائع کریں گے اور اس طرح ہمارے ساتھ ہمارے قارئین کو بھی کسی نتیجے پر پہنچنے میں مدد ملے گی۔ جزاکم اللہ خیراً۔

آخری بات یہ ہے کہ دین کا طالب علم ہونا ہمارے لیے اعزاز کی بات ہے اور ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں طالب علم ہی رکھے۔ ہم نے عہد اور سوچ سمجھ کر یہ پالیسی اپنائی ہے کہ ہم دینیاتی اور اختلافی مسائل پر نہیں لکھتے اور بولتے، لیکن واضح رہے کہ ہم میڈیکل ڈاکٹر نہیں ہیں، عمراسلامیات اور عربی پڑھتے پڑھاتے ہی گزری ہے۔ ہاں بعض لوگوں کے پاس دوسروں کا علم نا پنے کے اپنے گزرتے ہیں اور وہ اسی پہ مطمئن اور خوش رہتے ہیں، تو وہ خوش ہوتے رہیں۔ ہم اپنی طالب علمی پر خوش اور قانع ہیں، والحمد للہ علی ذلک۔

## تبدیلی ایڈریس

تحریک اصلاح تعلیم اور اس کے مختلف شعبوں کے دفاتر ۱۷ اے فیصل ٹاؤن لاہور  
سے ۳۶۹ بی فیصل ٹاؤن، لاہور منتقل ہو گئے ہیں۔

موبائل: 0300-460 9522  
ای میل: info@safa.edu.pk

فون: 042-3516 9469  
ویب: www.safa.edu.pk



## سکولوں میں ترجمہ قرآن کی تعلیم

پاکستان کی ساری سیاسی جماعتوں کو اسے اپنے منشور میں شامل کرنا چاہیے

برصغیر ہندو پاک میں قرآن پاک کی تعلیم فہم کے ساتھ موجود تھی کیونکہ عربی اور فارسی ذریعہ تعلیم کے طور پر رائج اور داخل نصاب تھیں۔ تمام شعبہ ہائے زندگی میں قرآن پاک کی تعلیمات کی روشنی میں قوانین رائج تھے جن سے نہ صرف حکومتی ادارے بلکہ عوام الناس بھی قرآن پاک کی تعلیمات کے مطابق اپنی زندگی بسر کر رہے تھے۔

سترہویں صدی میں اُس دور کے حکمرانوں کی ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے فرنگیوں نے اقتدار پر اپنا تسلط جمانا شروع کر دیا اور اس طرح برصغیر ہندو پاک میں فرنگی راج عمل میں آنے لگا اور جوں جوں فرنگی راج نے اپنا تسلط جمایا اور نظام حکومت پر اپنی گرفت مضبوط کی تو دیگر قوموں کی طرح انہوں نے بھی سارے شعبہ ہائے زندگی میں اپنے مذہبی اور معاشرتی انداز رائج کرنے کی ابتداء کر دی۔ اس نے ہمارے نظام تعلیم پر کاری ضرب لگائی اور ایک حکومتی آرڈر کے ذریعے مروجہ ذریعہ تعلیم یعنی عربی اور فارسی کو یکسر تبدیل کر کے انگریزی کو رائج کر دیا اور یہ قرار دیا کہ آئندہ عربی اور فارسی کے فارغ التحصیل کو کسی جگہ ملازمت نہ ملے گی۔ اس حکم نامے کے ذریعے برصغیر کے مسلمانوں میں نہ صرف اقتصادی بد حالی کا ایک نہ ختم ہونے والا دور شروع ہوا بلکہ وہ اپنی اصل اقدار اور مسلم کلچر سے بھی دور ہوتے چلے گئے اور پیٹ کی خاطر انہوں نے جدید طریقہ تعلیم کو مجبوراً اختیار کر لیا۔ ایک مخصوص طبقہ نے اپنے روایتی طریقہ تعلیم یعنی دینی تعلیم کو اپنا رکھا جس کے لیے وہ آج بھی مصروف عمل ہیں لیکن ذریعہ تعلیم کی اس تبدیلی کی بناء پر عوام الناس کی ایک کثیر تعداد اب بھی اسلامی تعلیمات سے بے بہرہ ہے۔

حکومتی سطح پر دینی اور دنیاوی تعلیم کے سلسلے میں کئی مرتبہ ایسی کوششیں ہو چکی ہیں کہ قرآن حکیم کو دوبارہ قابل فہم بنانے کے لیے کوئی ٹھوس طریق کار رائج کیا جائے مگر استعماری قوتیں ان اقدامات پر عمل نہیں ہونے دیتیں۔ اس سلسلے میں دو مرتبہ تو ماضی قریب میں کوششیں کی گئی۔ پہلی مرتبہ ۱۹۸۸ء میں ایک صدارتی حکم نامے (جب کہ عنان حکومت جنرل ضیاء الحق شہید کے ہاتھ میں تھی) کے ذریعے ایک

ایسی اسکیم رائج کرنے کے لیے قصر صدارت سے احکامات جاری کیے گئے جس کے تحت قرآن حکیم کا ایک یکساں ترجمہ (جس پر چاروں مسالک کے علماء کرام متفق ہوں) مدون کروا کر شامل نصاب کرنا مقصود تھا۔ اس حکم نامے میں اس بات کی گنجائش رکھی گئی تھی کہ اگر کسی خاص مسلک کے علماء کا کسی آیت پر اختلاف رائے ہو تو حاشیہ میں حوالہ دے کر متعلقہ علماء کی رائے کے مطابق اس کی تشریح و وضاحت کر دی جائے تاکہ اختلاف رائے نہ رہے۔

اس اسکیم کو ۱۹۸۸ء میں تیار کیا گیا اور پروگرام کے تحت یہ اسکیم مکمل ہو کر پاروں کی صورت میں ساتھ ساتھ رائج کی جانی تھی اور پہلا پارہ جماعت ششم سے شروع ہونا تھا اور بی اے تک تعلیم حاصل کرنے والے ہر طالب علم کو تیس پارے لازمی طور پر مکمل نصاب کے ساتھ پڑھنا تھے مگر بد قسمتی سے یہ کام تعطل کا شکر ہو گیا۔ جون ہی ۱۷ اگست ۱۹۸۸ء کو جنرل ضیاء الحق کا جہاز فضاء میں Crash ہوا زمین پر اس اسکیم کو وزارت تعلیم میں Crash کا سامنا کرنا پڑا، جہاں پر یہ وزارت ایوان صدر کے احکام کی تعمیل و تکمیل میں دن رات مصروف تھی لیکن اس کا رخیر میں بے شمار کاوٹیں کھڑی کی جا رہی تھی اور وزارت تعلیم عجیب کشمکش کا شکار تھی۔ ضیاء الحق کے حادثہ نے ایک سکوت کا عالم طاری کر دیا۔ متفقہ ترجمہ قرآن پاک کی فائل کو آنے والی حکومت کے انتظار میں چھوڑ دیا گیا۔

۱۹۸۸ء میں پاکستان پیپلز پارٹی نے عددی اکثریت کی بناء پر حکومت حاصل کی اور اس میں وزارت تعلیم کا قلم دان سندھ کے غلام مصطفیٰ شاہ صاحب کے حصے میں آیا۔ وزیر تعلیم موصوف کے پاس جب یہ فائل پہنچی تو انہوں نے غیر ضروری اعتراضات لگا کر فائل کو سرد خانے میں ڈلوادیا۔ اس طرح پیپلز پارٹی کے پہلے دور میں جب محترمہ بے نظیر بھٹو صاحبہ وزیراعظم تھیں ترجمہ قرآن کا کام سرد خانے میں پڑا رہا۔

۱۹۹۰ء میں جب آئی جے آئی کے پلیٹ فارم سے میاں نواز شریف صاحب نے اقتدار سنبھالا تو وعدہ کے مطابق (انتخابی منشور پر عمل درآمد کے لیے) انہوں نے شریعت بل کا نفاذ عمل میں لانا تھا مگر ایک طرف عوامی سطح پر نفاذ عمل کے لیے دباؤ اور دوسری طرف استعماری قوتوں کا دباؤ کہ شریعت بل کا نفاذ نہ ہو لہذا درمیانی حل یہ نکالا گیا کہ شریعت بل کا نفاذ عمل میں لانے کے لیے ہر شعبہ ہائے زندگی سے رائے حاصل کرنے اور سفارشات تیار کرنے کے لیے ایک کمیشن قائم کر دیا گیا۔ یہ ایک ایسا طریقہ ہے جس سے کسی بھی معاملے کو طول دینے کے لیے کافی وقت مل جاتا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا نہ کسی کمیشن کی رپورٹ

سامنے آئی اور نہ کسی شعبہ ہائے زندگی میں اس کے نفاذ کی راہ ہموار ہو سکی اور یوں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کی وجہ سے اس حکومت کا بھی جلد ہی خاتمہ ہو گیا۔

قرآن پاک کے فہم کو عام کرنا چونکہ راقم کے نزدیک بہت اہم ہے اس لیے اس نے وزارت تعلیم سے قرآن پاک کے ترجمہ کے نفاذ کے لیے کئی بار خط و کتابت کی۔ جب ۱۹۹۱ء میں مجھے یہ بتایا گیا کہ تعلیم کے متعلق کمیشن قائم کر دیا گیا ہے اور مذکورہ ایڈریس پر جا کر آپ اپنی تجاویز دے سکتے ہیں تو میں ایک دن کمیشن کے دفتر جا پہنچا اور چیئر مین صاحب (جو غالباً ایک سینیٹر تھے) سے ملاقات کی اور ان کو اپنا مقصد بتایا تو بہت مایوسی ہوئی اور میں شکستہ دل کے ساتھ واپس آ گیا۔ جب کچھ عرصے بعد آئی جے آئی کی حکومت ختم ہو گئی تو اس کے بعد الیکشن کے ذریعے پی پی پی کی حکومت آئی تو پچھلے تجربہ کے تحت اس حکومت سے خیر کی توقع نہ رکھتے ہوئے میں بھی خاموش رہا اور جلد ہی یہ حکومت اُن کے اپنے ہی صدر (فاروق لغاری صاحب) نے ختم کر دی۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ پی پی پی کی حکومتیں اسلامی شعائر کا برملا مذاق اُڑانے پر ختم ہوئیں۔ جب محترمہ بینظیر بھٹو صاحبہ نے علی الاعلان یہ کہہ کر کہ ”اسلامی سزائیں غیر انسانی ہیں“ اسلام کی توہین کی تو اس کے چند ہی روز بعد ان کی اپنی ہی پارٹی کے منتخب صدر نے ان کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ اسی طرح ماضی میں بھٹو صاحب کی حکومت کا زوال بھی ان کی اس تقریر سے شروع ہوا جس میں انہوں نے شراب کے بارے میں ایک عوامی اجتماع میں سرعام کہا تھا کہ میں تھک جانے پر تھوڑی سی پی لیتا ہوں لوگوں کا خون تو نہیں پیتا۔ ان باتوں کا اظہار اس موضوع سے براہ راست تعلق نہیں ہے لیکن ان سے ہماری اس رائے کو تقویت ملتی ہے کہ اگر کوئی شخص خصوصاً حاکم وقت اگر سرعام قرآنی تعلیمات کا استخفاف کرے تو اس کی سزا نہ صرف ذاتی طور پر اس شخص کو جگہ لٹا پڑتی ہے بلکہ بسا اوقات عوام الناس بھی اُس کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتے کیونکہ وہ بھی اسے برسرِ اقتدار لانے اور اسے برداشت کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔

۱۹۹۷ء کے الیکشن میں مسلم لیگ (ن) نے اپنے منشور میں اعلان کیا کہ قرآن پاک کی تعلیم سکولوں میں ترجمہ کے ساتھ لازمی ہوگی۔ مسلم لیگ کی حکومت برسرِ اقتدار آنے پر نواز شریف صاحب نے پارٹی منشور پر عمل درآمد کے لیے کوششیں شروع کیں تو آٹھویں تعلیمی پالیسی میں، جس کا اجراء ۲۷ مارچ ۱۹۹۸ء کو ہوا، یہ اعلان کیا گیا کہ قرآن پاک کی تعلیم ترجمہ کے ساتھ چھٹی سے بارہویں تک لازمی ہوگی۔ متعلقہ پالیسی Provision کے الفاظ یہ تھے:

"Teaching of Holy Quran with translation will be

introduced from Class VI and will be completed by class XII"

جب اس اسکیم کا اجراء ہوا تو وزارت تعلیم نے اپنے سابقہ تلخ تجربہ کی بناء پر ایک ایسے اردو ترجمہ قرآن پر، مسالک کے اختلاف سے پاک، نیا کام کرنے کی بجائے مولانا فتح محمد جالندھری مرحوم کے ترجمہ قرآن کو منتخب کر لیا۔ عجلت کے ساتھ اُس کا نصاب تیار کرایا اور ماسٹر ٹرینز بھی تیار کر دیئے۔

۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء تاریخ کا ایسا سیاہ دن تھا جس میں رات کے اندھیرے میں اقتدار پر شب خون مارا گیا جس میں نہ صرف نواز شریف صاحب کی دو تہائی سے زیادہ اکثریت والی حکومت ختم ہوئی بلکہ تمام شعبہ ہائے زندگی میں استعماری قوتوں نے خلاف اسلام اقدامات رائج کرانے کے لیے جال پھیلا نا شروع کر دیئے۔ چنانچہ تاریخ کا پہلیہ پھر اُلٹا چلنا شروع ہو گیا اور آمر نے وفاقی وزارت تعلیم کے لیے محترمہ زبیدہ جلال صاحبہ کا انتخاب کیا جنہوں نے اُن ہدایات کی روشنی میں کام کا آغاز کیا جس کے لیے انہیں منتخب کیا گیا تھا۔ محترمہ زبیدہ جلال صاحبہ بلوچستان کے ایک پسماندہ علاقے ٹربت میں امریکہ کی مدد سے ایک این جی او چلا رہی تھیں اور اُن کے مفادات کے تحفظ کے لیے کام کر رہی تھیں۔ انہوں نے وفاقی وزارت تعلیم کا چارج سنبھالتے ہی اُس ایجنڈے پر کام شروع کر دیا جس کے لیے ان کا انتخاب کیا گیا تھا۔ محترمہ نے آٹھویں تعلیمی پالیسی کو جس کا اجراء برائے نفاذ ۲۷ مارچ ۱۹۹۸ء کو ہوا تھا، رول بیک کر دیا اور اس طرح قرآن پاک کو ترجمے کے ساتھ پڑھائے جانے کی بات بھی تشنہ تکمیل رہ گئی۔

زبیدہ جلال صاحبہ کے دور میں تعلیم کے شعبے میں جو شب خون مارا گیا اس کی مثال ماضی میں نہیں ملتی۔ آٹھویں تعلیمی پالیسی جس کے اجراء کے بنیادی خدوخال پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کے اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے مرتب کیے گئے تھے، اسے ختم کر کے متبادل نظام تعلیم جاری کر دیا گیا۔ یوں ۱۹۹۹ء تا ۲۰۰۸ء اس لحاظ سے تاریخ کا سیاہ ترین دور تھا جس میں ہماری حکومت نے امریکہ کے اشارے پر اپنے نظام تعلیم کو مغربی نظریات کے مطابق ڈھالنے کے لیے، اصلاحات کے نام پر متعدد بالواسطہ اور بلاواسطہ ایسے اقدامات کیے جن کے برے اور دور رس نتائج ہماری قوم کو بھگتنا ہوں گے۔

ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ۹/۱۱ کے واقعہ کی سزا اسلامی جمہوریہ پاکستان کی آنے والی نسلوں کو بھگتنا ہوگی۔ ان تمام سالوں میں (یعنی ۱۹۹۹ء تا ۲۰۰۸ء) امریکی اعلیٰ عہدیدار جب بھی پاکستان آتے تو خاص

طور پر ان کی ملاقات کا ایک بڑا مقصد وفاقی وزیر تعلیم اور مشرف صاحب سے ملاقات ہوتا تھا جس کی تفصیلات تو عوام الناس تک نہ پہنچ سکتی تھیں لیکن اخباری ذرائع اس امر کی غمازی کرتے تھے کہ دونوں حکومتوں کے درمیان باہمی طور پر اس امر کی اجازت تھی کہ وہ تعلیمی معاملات میں ایک دوسرے کی مداخلت برداشت کر سکتے تھے۔ سوال یہ ہے کہ کیا پاکستان کے اعلیٰ احکام کو امریکی نظام تعلیم میں دخل اندازی کی اجازت تھی؟ یہ اصل سوال ہے جو ہر پاکستانی اپنے ارباب و اختیار سے کرتا ہے کہ کیا ہمیں اپنی نظریاتی حدود کی حفاظت کا حق حاصل ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو ہمارے سیاستدان جو زندگی کے سارے مسائل سے آگاہ ہونے کے دعویدار ہیں اور مستقبل کی منصوبہ بندی اور اُس پر عمل درآمد کے لیے ٹھوس قانونی اور آئینی اقدامات کر سکتے ہیں، کیوں کر ہماری موجودہ اور آنے والی نسلوں کی اسلامی تعلیم و تربیت کے لیے ترجمہ قرآن کا انتظام نہیں کرتے؟

ہماری پاکستان کی تمام سیاسی جماعتوں سے گزارش ہے کہ وہ آنے والے الیکشن میں اپنے منشور میں درج ذیل الفاظ ضرور شامل کریں:

”چھٹی سے بارہویں جماعت تک تمام طلباء اور طالبات کے لیے اردو ترجمے کے ساتھ قرآن پاک کی تعلیم لازمی ہوگی۔“

تاکہ نئی حکومت کے قیام کے بعد قرآن پاک کی با ترجمہ تعلیم کے لیے ایسی قانون سازی ہو جائے جس پر کوئی بیرونی قوت اثر انداز نہ ہو سکے اور ہم اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ قرآن حکیم کو اپنے نونہالوں کے ذہنوں میں راسخ کر کے پاکستانی قوم کو ناقابلِ تسخیر بنا سکیں۔

## پاکستان میں اسلامی تبدیلی کیسے آ سکتی ہے؟ (۲) چند اعتراضات اور ان کے جوابات

البرہان کے گزشتہ شمارے میں شائع ہونے والے ہمارے مضمون 'پاکستان میں اسلامی تبدیلی کیسے آ سکتی ہے؟' پر ہمیں جو رد عمل موصول ہوا ہے اس میں سے دو پر ہم کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔ میانوالی سے جناب محمد ریاض خٹک صاحب نے لکھا ہے کہ مدرسہ کا جو خاکہ آپ نے پیش کیا ہے، ہمارا تہیہ ہے کہ ان شاء اللہ اسے عملی جامہ پہنائیں گے۔ اس سلسلے میں کچھ پراجیکٹس پر کام جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں کامیابی عطا فرمائیں اور سال ڈیڑھ میں یہ مدرسہ قائم ہو جائے۔ سماجی میدان میں بھی جو نقشہ کار آپ نے تجویز کیا ہے اس پر کام کا بھی ارادہ ہے البتہ جہاد پر آپ کا موقف محل نظر ہے۔

خٹک صاحب کی خدمت میں عرض ہے کہ ضروری نہیں ہے کہ آپ ہماری ہر بات سے اتفاق کریں اور نہ ہم پر وحی والہام نازل ہوتا ہے کہ ہماری ہر بات ہر لحاظ سے صحیح ہو اور اس میں غلطی کا شائبہ تک نہ ہو۔ آپ دلیل سے ہماری بات سے اختلاف بھی کر سکتے ہیں اور اسے رد بھی کر سکتے ہیں۔ آپ نے وضاحت نہیں کی کہ آپ کو جہاد کے بارے میں ہمارے موقف کے کس حصے سے اختلاف ہے کیونکہ جیسا کہ ہم نے کہا تھا کہ ہم جہاد یعنی اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے جانے والی پُر امن کوششوں اور قتال یعنی اقدامی اور دفاعی جہاد سب کے قائل ہیں۔ البتہ عصر حاضر میں جہاد بمعنی خروج کے بارے میں ہم نے عرض کیا تھا کہ چونکہ ہمارے دینی عناصر نے نفاذ شریعت کے لیے پُر امن جدوجہد کا حق ادا نہیں کیا اور نہ اس کے لیے کی جانے والی مسلح جدوجہد کی کامیابی کا کوئی امکان ہے لہذا ہم اس کی حمایت نہیں کرتے اور اب جبکہ تحریک طالبان پاکستان نے خود مذاکرات کرنے (گویا بالواسطہ طور پر مسلح جدوجہد ترک کرنے) پر آمادگی ظاہر کر دی ہے تو اس سے ہمارے اس موقف کی تائید ہوتی ہے کہ محض مسلح جدوجہد سے پاکستان میں اسلامی انقلاب نہیں لایا جاسکتا جب تک کہ عوام یعنی عامۃ الناس اسلامی تعلیمات پر عمل نہ کریں اور اسلامی عناصر کی حمایت نہ کریں اور جب تک خواص یعنی سیاستدان، بیوروکریسی اور فوج وغیرہ کی ذہنی و قلبی تطہیر نہ ہو اور وہ اہل مغرب اور ان کی ملحدانہ فکر و تہذیب اور ان کے مفادات کو رد کرتے ہوئے اسلام کے مطابق انفرادی اور اجتماعی زندگی گزارنے پر یکسو نہ ہو جائیں، اس وقت تک محض طاقت سے (جہاد کے نام پر) حالات کو عملاً تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔

دوسرا اعتراض یہ سامنے آیا ہے کہ آپ نے سارے تجزیے کے بعد بالآخر انہی دینی سیاسی جماعتوں کی حمایت کی ہے جو انتخابات کے ذریعے تبدیلی لانا چاہتی ہیں حالانکہ آپ خود تسلیم کرتے ہیں کہ وہ عملاً ناکام ہو چکی ہیں اور مغربی جمہوریت غیر اسلامی ہے اور اس کے ذریعے اسلامی انقلاب نہیں آ سکتا، اور پرامن انقلاب بذریعہ عوامی قوت کو آپ نے زیادہ اہمیت نہیں دی حالانکہ طاہر القادری صاحب سے لاکھ اختلاف کیا جائے، اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ان کا لانگ مارچ اور دھڑا بڑی حد تک کامیاب رہا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ عوامی قوت سے پرامن اسلامی انقلاب لایا جاسکتا ہے۔ عرب ممالک میں حال ہی میں اسلامی قوتوں کو کامیابی ملی ہے اور اس سے پہلے ایران میں بھی عوامی حمایت سے انقلاب آچکا ہے تو آخر پاکستان ہی میں عوامی قوت سے پرامن اسلامی انقلاب کیوں نہیں آ سکتا؟

ہماری رائے میں اس موقف میں کئی غلطیاں، غلط فہمیاں اور مغالطے موجود ہیں۔ ایران کی مثال اس لیے غلط ہے کہ وہاں اہل تشیع کی بہت بڑی اکثریت موجود ہے جس میں میں ذہنی ہم آہنگی موجود تھی۔ مذہبی طبقہ متحد اور منظم تھا، خمس کی وجہ سے اسے مالی وسائل بھی میسر تھے، پھر دونوںوں سے رضا شاہ کا جبر اور اسلامی تعلیمات کے خلاف تشدد موجود تھا جس کے رد عمل میں مذہبی طبقے کی طویل اور متحدہ مزاحمتی جدوجہد سے بالآخر عوام متحرک ہو گئے اور فوج سمیت ریاستی اور معاشرتی ادارے اس عوامی قوت کے سیلاب میں بہ گئے۔ یہ حالات پاکستان میں موجود نہیں اور نہ ہو سکتے ہیں کیونکہ یہاں مذہبی ہم آہنگی موجود نہیں۔ مسلکی تفریق یہاں بہت گہری ہے اور بڑی مدت سے ہے لہذا اسے پاٹا نہیں جاسکتا اور نہ ایران کی طرح کی متحدہ اور مخلصانہ و مدبرانہ مذہبی قیادت اہل پاکستان کو میسر آ سکتی ہے۔ قدیم و جدید تعلیم کے باہم مخالف و متضاد دھاروں نے معاشرے کو تقسیم کر رکھا ہے۔ مغرب زدہ حکمران طبقات اور اسلام پسند عوام میں کشمکش ضرور موجود ہے لیکن برصغیر میں جمہوریت اور انتخابات کے تسلسل نے عوامی جذبات کا لاوا جمع نہیں ہونے دیا بلکہ اس کی نکاسی ہوتی رہتی ہے لہذا اس لاوے کے پھٹ پڑنے کا کوئی امکان نہیں۔ غرض پاکستان کے حالات کو ایران پر قیاس کرنا ہی غلط ہے۔

عرب ممالک کے حالات بھی پاکستان سے مختلف ہیں وہاں بنیادی مسئلہ اسلامی انقلاب کا نہیں بلکہ آمریت کے جبر و تشدد سے نجات کا تھا چنانچہ دینی و غیر دینی سیاسی عناصر آمریت سے نجات کے مسئلے پر متحد ہو گئے اور تبدیلی آ گئی۔ مغربی جمہوریت کی طرز پر مصر میں انتخابات میں الاخوان المسلمون کو ہمدردی کے ووٹ ملے کیونکہ وہ پچھلے اسی سال سے پرامن رہ کر حکومتی جبر و تشدد سہہ رہے تھے لیکن اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ سیکولر سیاسی قوتیں مغربی ملکوں کی درپردہ حمایت سے اخوان حکومت کو چلنے نہیں دے رہیں اور

انہوں نے پاکستان کی طرح کا اسلامی آئین بھی نہیں بنا سکے اور نہ غالباً پر امن اسلامی تبدیلی لانے کا موقع انہیں ملتا نظر آتا ہے۔ تینس میں بھی یہی حال ہے اور وہاں کی اسلامی جماعت آمریت کے خاتمے کے بعد سیکولر جمہوری قوتوں کے ساتھ مل کر حکومت چلا رہی ہے جس کے نتیجے میں وہاں 'اسلامی انقلاب' کی توقع رکھنا عبث ہے۔ یہی حال لیبیا کا ہے اور شام کی حالت تو دردناک ہے کیونکہ وہاں ایران اسلامی قوتوں کے خلاف آمرانہ حکومت کا صرف اس لیے ساتھ دے رہا ہے کہ وہاں کے حکمران شیعہ ہیں لہذا اس کشمکش سے ملک برباد ہو رہا ہے اور عوام عذاب میں مبتلا ہیں۔

اس وضاحت سے ظاہر ہے کہ پاکستان میں ایران جیسا انقلاب لانا اور عرب ممالک جیسی تحریک اٹھانا ممکن نہیں کہ یہاں کے حالات ان سے مختلف ہیں۔ دوسرے ہمارے ہاں کا تجربہ یہ ہے کہ عوامی تحریک چلا کر حکومت تو ہٹائی جاسکتی ہے (جیسے ایوب خان اور بھٹو کے عہد حکومت میں ہوا جس میں عوامی تحریک میں اسلامی اور سیکولر جمہوری قوتیں متحد ہو کر شامل تھیں) لیکن اس کے نتیجے میں دونوں دفعہ اسلامی انقلاب تو ایک طرف رہا جمہوریت بھی نہیں آسکی بلکہ دونوں دفعہ فوجی حکومتیں آئیں جن کے طویل دور حکومت کی ناکامی کے بعد سیاسی عمل بحال ہوا۔ تیسرے یہ کہ اسلامی قوتیں اگر کسی مسئلے پر جمع ہو جائیں تو کسی ایک جزوی اور محدود مسئلے میں حکومت کو گھٹے ٹیکنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے جیسے مسئلہ ختم نبوت میں ہوا کہ دینی قوتوں کو کامیابی مل گئی (یا اہل تشیع نے دھڑا دے کر زکوٰۃ کے حوالے سے اپنا مطالبہ منوالیا اور حال ہی میں طاہر القادری صاحب کے لانگ مارچ اور دھرنے کے نتیجے میں بظاہر حکومت ان کے کچھ مطالبے ماننے پر تیار ہو گئی) لیکن اس کامیابی سے اس نتیجے پر نہیں پہنچا جاسکتا کہ پاکستان کی کوئی ایک دینی جماعت یا دینی قوتیں مل کر ایسی کامیاب عوامی تحریک چلا سکتی ہیں جس کے نتیجے میں پر امن اسلامی انقلاب آجائے اور ملک میں اسلامی شریعت یا اسلامی نظام حیات نافذ ہو جائے، کیونکہ پاکستان میں کسی ایک جماعت کے پاس اتنی قوت نہیں کہ وہ کامیاب عوامی تحریک چلا سکے اور مسلکی تفریق کی وجہ سے دینی قوتیں اکٹھی نہیں ہوسکتیں۔

اور بالفرض ہو بھی جائیں تو حکومت بدل جائے گی لیکن نظام نہیں بدلے گا کیونکہ دینی قوتوں کا نفاذ شریعت کے کسی ایک پروگرام پر متحد ہو جانا اور یکجا ہو کر اسے عملی جامہ پہنانا نہایت مشکل بلکہ ناممکن نظر آتا ہے اور اس کی وجہ صرف مسلکی اختلافات نہیں بلکہ اس کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے دینی عناصر نے اس غرض سے کوئی ہوم ورک نہیں کیا۔ ان کے پاس نفاذ شریعت کے لیے کوئی واضح اور تفصیلی پروگرام، نقشہ کار اور ورک پلان موجود نہیں اور نہ ان پر عمل درآمد کر سکنے والے پروفیشنلز اور کارکنوں کی منظم ٹیم موجود



ہے۔ ان کے پاس صرف 'نفاذ شریعت' اور 'اسلامی انقلاب' کا نعرہ ہے (بلکہ اب تو نعرہ بھی دم توڑ رہا ہے) یہ صورت حال ایک بد قسمتی ہے لیکن تلخ اور سچی بات یہ ہے کہ حقیقت یہی ہے اور اس کے دو بڑے سبب ہیں: ایک یہ کہ دینی سیاسی جماعتوں نے انتخابات جیتنے کے لیے صرف سیاسی جدوجہد کی ہے لیکن اس کے لیے عوام کو نہ تعلیم دی ہے، نہ ان کی تربیت کی ہے اور نہ ان کے مسائل حل کرنے کی کوئی منظم کوشش کی ہے۔ انہوں نے دینی دعوت کا حق بھی ادا نہیں کیا کہ لوگوں میں دینی روح سرایت کر جاتی اور وہ اپنی انفرادی زندگی میں اچھے باعمل مسلمان بن جاتے۔ لہذا لوگ روایتی طور پر علماء کرام کا احترام تو کرتے ہیں اور مسجد و مدرسہ چلانے میں ان کا ساتھ بھی دیتے ہیں لیکن علماء کے بارے میں ان کا یہ تاثر نہیں ہے کہ یہ لوگ برسر اقتدار آ کر ان کے مسائل حل کر سکنے کی اہلیت و صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔

اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ علماء کرام کا وہ بہت بڑا طبقہ جو سیاسی جدوجہد میں عملاً شامل نہیں وہ بھی مسجد و مدرسہ تک محدود ہے اور لوگوں کی دینی تعلیم و تربیت، اصلاح اور ان کے دکھ درد دور کرنے کے لیے (جو شرعی تقاضا ہے) انہوں نے کوئی کام نہیں کیا بلکہ وہ بے حسی سے معاشرے کو ڈوبتے اور دین سے دور ہوتے دیکھ رہا ہے لیکن وہ اس کے لیے متحرک اور منظم ہو کر جدوجہد کرنے کے لیے تیار نہیں بلکہ سمجھتا ہے کہ مسجد میں نماز پڑھا کر اور چند طلباء کو دینی کتابیں پڑھا کر اس نے اپنی دینی ذمہ داری ادا کر دی ہے اور بس۔ اب اس کے کرنے کا مزید کوئی کام نہیں ہے۔

ان حالات میں اول تو اسلامی تبدیلی کے لیے پاکستان میں عوامی حمایت سے کوئی فیصلہ کن تحریک نہیں اٹھائی جاسکتی اور بفرض محال اٹھ بھی جائے تو زیادہ سے زیادہ حکومت کی تبدیلی یا فوج کی آمد پر منتج ہوگی (اور فوج بھی سیکولر اور مغرب پرست ہے اور بالفرض اگر کوئی دینی مزاج کا حامل جرنیل آ بھی جائے تو وہ معاشرے کو اسلامی لحاظ سے تبدیل کرنے کے ہنر سے واقف نہیں ہوتا کیونکہ یہ کام اس کی تعلیم و تربیت کا حصہ نہیں ہوتا اور پھر مقامی اور بین الاقوامی قوتیں اسے یہ کام کرنے نہیں دیتیں لہذا وہ ناکام ہو جاتا ہے جیسے کہ ضیاء الحق ہوا) خلاصہ یہ کہ پاکستان کے دینی عناصر کے پاس پر امن عوامی انقلاب لانے کے لیے منظم افرادی قوت موجود ہی نہیں، اس کے لیے مناسب تیاری کی ہی نہیں گئی جو اس طرح کی تحریک کو سنبھال سکے اور اسے کامیاب کر سکے۔ موجودہ فوج، پولیس، بیوروکریسی اور عدلیہ سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اسلامی انقلاب لاسکتی ہے یا اسلامی انقلاب لانے میں معاون ثابت ہو سکتی ہے، اہم قوتوں کی جنت یا خوابوں کی دنیا میں رہنا ہے۔ یہ کام اس وقت تک ممکن نہیں جب تک دینی جماعتیں وسیع پیمانے پر انسان سازی اور کردار سازی کا کام نہیں کرتیں جس کے لیے ذہن سازی اور فکری تطہیر کے سارے ذرائع

استعمال کرنے ضروری ہیں (جیسے تعلیم، تربیت، میڈیا وغیرہ) اور عوام کے دل جیتنے اور ان کی حمایت کے لیے ان کے دکھ درد دور نہیں کرتیں اور خدمت خلق کو اپنا شعار نہیں بناتیں، خصوصاً افلاس میں کمی، عدل و انصاف کی فراہمی اور امن و امان کی بحالی میں اپنا کردار ادا نہیں کرتیں۔

### پس چہ باند کرد

حالات کے اس تجزیے کے پیش نظر ہی ہم اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ پاکستان میں عوامی تحریک چلا کر اور پریشر گروپ کے طور پر کام کر کے نہ تو نظام تبدیل کیا جاسکتا ہے اور نہ ملک میں کوئی بڑی اور پائیدار تبدیلی لائی جاسکتی ہے۔ رہی دینی جماعتیں تو ہم نے ان کی کامیابی کے مشروط امکان کا ذکر کیا تھا کہ وہ کامیاب ہو سکتی ہیں بشرطیکہ وہ مسلکی اختلاف کو بھلا کر دین پر عمل کے کسی ایک پروگرام پر متفق ہو جائیں اور اس کے لیے متحد ہو کر جدوجہد کریں۔ ظاہر ہے جب تک وہ یہ شرائط پوری نہیں کرتیں ان کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں اور بظاہر ان شرائط کے پورا ہونے کے امکانات بھی معدوم ہیں۔ اسی لیے ہمارا موقف یہ تھا اور ہے کہ پاکستان کا اسلامی مستقبل خطرے میں ہے اور اس سے بچنے کی واحد صورت یہ ہے کہ دینی سیاسی جماعتوں کے علاوہ غیر سیاسی دینی عناصر اٹھیں اور رسول سوسائٹی کے دین دار افراد کو تحریک و منظم کر کے تعلیم، تربیت اور میڈیا کے صحیح استعمال کے ذریعے انسان سازی اور کردار سازی کا کام وسیع پیمانے پر کریں اور اسی طرح مسلمان عوام کے دکھ درد دور کرنے کے لیے خدمت خلق کے کام کو وسیع پیمانے پر منظم کریں اور افلاس دور کرنے، عدل و انصاف مہیا کرنے اور امن و امان بحال کرنے میں مستعد کردار ادا کریں تو پھر آہستہ آہستہ پاکستانی عوام دین کی طرف پلٹیں گے اور دینی عناصر کے قدردان ہوں گے اور دینی عناصر کو ان کی حمایت میں آسکے گی۔ دینی سیاسی جماعتوں کو بھی، سیاسی جدوجہد کے ساتھ ساتھ، یہی دینی کام کرنے چاہئیں تاکہ ان کی حمایت کے لیے زمین ہموار ہو سکے۔ اگر علماء کرام، دینی جماعتیں اور ادارے (سیاسی و غیر سیاسی دونوں) اور رسول سوسائٹی کے دین دار افراد یہ کام کرنے کے لیے نہیں اٹھتے تو ہمارے نزدیک پاکستان کا دینی مستقبل خطرے میں ہے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ سے بہتری کی دعا اور توقع کرنی چاہیے اور مایوس نہیں ہونا چاہیے لیکن قرآن حکیم کے مطابق اللہ تعالیٰ کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ جب تک لوگ خود بدلنے کے لیے تیار نہ ہوں وہ لوگوں کو زبردستی ہدایت نہیں دیتا اور نہیں بدلتا۔ و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین۔

## سیاسی جماعتوں سے ملی مجلس شرعی کا مطالبہ

ملک بھر کے ۵۷ علماء کرام کے طے کردہ نفاذ شریعت کے متفقہ ۱۵ نکات کو اپنے منشور کا حصہ بنائیں

چونکہ اسلامی تعلیمات کا یہ تقاضا ہے کہ مسلمان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی قرآن و سنت کے مطابق گزاریں اور پاکستان اسی لئے بنایا گیا تھا کہ یہ اسلام کا قلعہ اور تجربہ گاہ بنے لہذا 1951ء میں سارے دینی مکاتب فکر کے معتمد علیہ 31 علماء کرام نے عصر حاضر میں ریاست و حکومت کے اسلامی کردار کے حوالے سے جو 22 نکات تیار کیے تھے انہوں نے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور کو ٹھوس بنیادیں فراہم کیں اور ان کی روشنی میں پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنانے کے حوالے سے کئی دستوری انتظامات بھی کر دیے گئے لیکن ان میں سے اکثر زینت قرطاس بنے ہوئے ہیں اور ان پر کوئی عمل درآمد نہیں ہو سکا۔ مزید برآں کچھ اور دستوری خلا بھی سامنے آئے ہیں جو پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنانے کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں چنانچہ نفاذ شریعت کے حوالے سے حکومتی تساہل پسندی کا نتیجہ یہ سامنے آیا ہے کہ پاکستان کے شمال مغربی سرحدی قبائلی علاقوں کے بعض عناصر نے بزور قوت شریعت کی من مانی تعبیرات کو نافذ کرنے کے لیے مسلح جدوجہد کا آغاز کیا۔ اس مسلح جدوجہد کے شرکاء نے ایک طرح سے حکومتی رٹ کو چیلنج کر دیا جب کہ اس صورت حال کو امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے دہشتگردی کے ساتھ نتھی کر کے افواج پاکستان کو اس مسلح جدوجہد کے شرکاء کے سامنے لاکھڑا کیا اور یوں دونوں طرف سے ایک دوسرے کے ہاتھوں مسلمانوں کا ہی خون بہہ رہا ہے حالانکہ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ان سرگرمیوں کی پشت پناہی بھی خود امریکہ، بھارت اور اسرائیل ہی کر رہے ہیں۔ پاکستان کے دیگر پُر امن علاقے بھی اس جنگ کے اثرات سے محفوظ نہیں ہیں تقریباً تمام بڑے شہروں میں آئے دن دہشتگردی اور خودکش حملوں کی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں جن میں اب تک ہزاروں معصوم شہری اپنی جانیں گنوا بیٹھے ہیں۔ یہ صورت حال تقاضا کرتی ہے کہ تمام مکاتب فکر کے نمائندہ علماء کرام ایک مرتبہ پھر مل بیٹھیں اور باہمی غور و فکر اور اتفاق رائے سے ان امور کی نشاندہی کر دیں جن کی وجہ سے پاکستان ابھی تک ایک مکمل اسلامی ریاست نہیں بن سکا اور نہ ہی یہاں نفاذ شریعت کا کام پایہ تکمیل تک پہنچ سکا ہے۔ تمام مکاتب فکر کے نمائندہ علماء کرام کی یہ کوشش اس مرحلہ پر اس لیے ناگزیر ہے کہ ان کی اس کوشش سے ہی نہ صرف ان اسباب کی نشاندہی ہوگی جو نفاذ شریعت کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں بلکہ نفاذ شریعت کے

لیے متفقہ رہنما اصولوں کے ذریعے وہ سمت اور راستہ بھی متعین ہو جائے گا جس پر چل کر یہ منزل حاصل کی جاسکتی ہے۔ دراصل نفاذ شریعت کی منزل کا حصول ہی اس بات کی ضمانت فراہم کر سکتا ہے کہ آئندہ پاکستان کے کسی علاقے سے نفاذ شریعت کے نام پر مسلح جارحیت کا ارتکاب اور حکومتی رٹ کو چیلنج نہ کیا جاسکے چنانچہ اس حوالے سے تجویز کیے گئے اقدامات پیش خدمت ہیں:

۱۔ ہمارے حکمرانوں کی یہ شرعی ذمہ داری ہے کہ وہ فرد کو بھی شریعت پر عمل کے قابل بنائیں اور معاشرے اور ریاست کو بھی شریعت کے مطابق چلائیں۔ دینی عناصراً کا بھی فرض ہے کہ وہ دعوت و اصلاح اور تبلیغ و تذکیر کے ذریعے فرد کی بھی تربیت کریں، حکمرانوں پر بھی دباؤ ڈالیں کہ وہ اپنی دینی ذمہ داریاں پوری کریں اور جہاں تک قانون اجازت دے خود بھی نفاذ شریعت کے لئے ضروری اقدامات کریں۔ اسی طرح ہر مسلمان کی یہ ذاتی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اسلامی تعلیمات پر عمل کرے۔

۲۔ یہ کہ پاکستان میں نفاذ شریعت کی بنیاد ۱۹۵۱ء میں سارے مکاتب فکر کے علماء کرام کی طرف سے متفقہ طور پر منظور کردہ ۲۲ نکات ہیں اور موجودہ دستاویز کے ۱۵ نکات کی حیثیت بھی ان کی تفریع اور تشریح کی ہے۔

۳۔ یہ کہ پاکستان میں شریعت کا نفاذ پر امن جدوجہد کے ذریعے ہونا چاہیے کیونکہ یہی اسلامی تعلیمات اور دستور پاکستان کا مشترکہ تقاضا ہے اور عملاً بھی اس کے امکانات موجود ہیں۔ نیز شریعت کا نفاذ سارے دینی مکاتب فکر کی طرف سے منظور شدہ متفقہ رہنما اصولوں کے مطابق ہونا چاہیے (یہ ۱۵ نکات اس قرارداد کا حصہ ہیں) اور کسی گروہ یا جماعت کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی مرضی کا اسلام سارے معاشرے پر قوت سے ٹھونس دے۔

۴۔ دستور پاکستان کے قابل نفاذ حصے میں بصراحت یہ لکھا جائے کہ قرآن و سنت مسلمانوں کا سپریم لاء ہے اور اس تصریح سے متصادم قوانین کو منسوخ کر دیا جائے۔ یہ دستوری انتظام بھی کیا جائے کہ عدلیہ کی طرف سے دستور کی کوئی ایسی تعبیر معتبر نہ ہوگی جو کتاب و سنت کے خلاف ہو اور دستور کی کسی بھی شق اور مقتضی، عدلیہ اور انتظامیہ کے کسی بھی فیصلے کو کتاب و سنت کے خلاف ہونے کی صورت میں اعلیٰ عدالتوں میں چیلنج کیا جاسکے۔ نیز ان دستوری دفعات کو دستور میں بنیادی اور ناقابل تنسیخ دفعات قرار دیا جائے۔ آئین توڑنے سے متعلق دفعہ 6A اور عوامی نمائندوں کی اہلیت سے متعلق دفعات 62، 63 کو مؤثر اور ان پر عمل درآمد کو یقینی بنایا جائے۔ کسی بھی ریاستی یا حکومتی عہدیدار کی قانون سے بالاتر حیثیت اور استثنائی پر مبنی دستوری شکوں کا خاتمہ کیا جائے۔

وفاقی شرعی عدالت اور سپریم کورٹ کے شریعت ایبلٹ پنچ کے جج صاحبان کو دیگر اعلیٰ عدالتوں کے جج صاحبان کی طرح باقاعدہ جج کی حیثیت دی جائے اور ان کے سٹیٹس اور شرائط تقرری و ملازمت کو دوسری اعلیٰ عدالتوں کے جج صاحبان کے سٹیٹس اور شرائط تقرری و ملازمت کے برابر لایا جائے۔ بعض قوانین کو وفاقی شرعی عدالت کے دائرہ اختیار سے مستثنیٰ قرار دینے کے فیصلوں پر نظر ثانی کی جائے اور وفاقی شرعی عدالت کو ملک کے کسی بھی قانون پر نظر ثانی کا اختیار دیا جائے۔ وفاقی شرعی عدالت اور شریعت ایبلٹ پنچ کو آئینی طور پر پابند کیا جائے کہ وہ مناسب وقت (Time frame) کے اندر شریعت پیشوں اور شریعت ایبلوں کا فیصلہ کر دیں۔ وفاقی شرعی عدالت اور سپریم کورٹ کی طرح صوبائی، ضلعی اور تحصیل سطح کی عدالتوں میں بھی علماء ججوں کا تقرر کیا جائے اور آئین میں جہاں قرآن و سنت کے بالاتر قانون ہونے کا ذکر ہے وہاں نبی کریم ﷺ کے شارع ہونے کا ذکر بھی کیا جائے۔ حکومت اسلامی نظریاتی کونسل میں تمام مکاتب فکر کے جید علماء بطور رکن نامزد کرے۔ ہر مکتبہ فکر اپنا نمائندہ اپنے حلقوں سے مشاورت کے بعد تجویز کرے۔ نفاذ شریعت کے حوالے سے جن نکات پر ارکان کی اکثریت کا اتفاق ہو جائے حکومت چھ ماہ کے اندر اسے قانون بنا کر پاس کرنے کی پابند ہو۔

۵۔ پاکستان کے قانونی ڈھانچے میں پہلے سے موجود اسلامی قوانین پر مؤثر طریقے سے عمل درآمد کیا جائے اور اسلامی عقوبات کے نفاذ کے ساتھ ساتھ مؤثر اصلاحی کوششیں بھی کی جائیں۔

۶۔ اسلامی اصول و اقدار کے مطابق عوام کو بنیادی ضروریات و سہولیات زندگی مثلاً روٹی، کپڑا، مکان، علاج معالجہ اور تعلیم فراہم کرنے، غربت و جہالت کے خاتمے اور عوامی مشکلات و مصائب دور کرنے اور پاکستانی عوام کو دنیا میں عزت اور وقار کی زندگی گزارنے کے قابل بنانے کو اولین ریاستی ترجیح بنایا جائے۔

۷۔ موجودہ سیاسی نظام کی اسلامی تعلیمات کے مطابق اصلاح کی جائے مثلاً عوامی نمائندگی میں سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی حوصلہ شکنی اور غریب اور متوسط طبقے کی نمائندگی کی حوصلہ افزائی کے لیے ٹھوس عملی اقدامات کیے جائیں نمائندگی کے لیے شرعی شہادت کی اہلیت کو لازمی شرط قرار دیا جائے۔ متناسب نمائندگی کا طریقہ اپنایا جائے۔ علاقائی، نسلی، لسانی اور مسلکی تعصبات کی بنیاد پر قائم ہونے والی سیاسی جماعتوں پر پابندی لگائی جائے اور قومی یکجہتی کے فروغ کے لیے مناسب پالیسیاں اور ادارے بنائے جائیں

۸۔ تعلیمی نظام کی اسلامی تناظر میں اصلاح کے لیے قومی تعلیمی پالیسی اور نصابیات کو اسلامی اور قومی سوچ کے فروغ کے لیے تشکیل دیا جائے جس سے یکساں نظام تعلیم کی حوصلہ افزائی اور طبقاتی نظام

تعلیم کا خاتمہ ہو، اساتذہ کی نظریاتی تربیت کی جائے اور تعلیمی اداروں کا ماحول بہتر بنایا جائے۔ مخلوط تعلیم ختم کی جائے اور مغربی لباس کی پابندی اور امور تعلیم میں مغرب کی اندھی نقالی کی روش ختم کی جائے۔ تعلیم کا معیار بلند کیا جائے۔ پرائیویٹ تعلیمی اداروں کو قومی نصاب اپنانے کا پابند بنانے اور ان کی نگرانی کا مؤثر نظام وضع کرنے کے لیے قانون سازی کی جائے۔ تعمیر سیرت اور کردار سازی کو بنیادی اہمیت دی جائے۔ تعلیم سے شہویت کا خاتمہ کیا جائے۔ دینی مدارس کے نظام کو مزید مؤثر و مفید بنانے اور اسے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے ضروری اقدامات کیے جائیں تاکہ بین الممالک ہم آہنگی کو فروغ ملے اور فرقہ واریت میں کمی واقع ہو دینی مدارس کی ڈگریوں کو تسلیم کیا جائے۔ تعلیم کے لئے وافر فنڈز مہیا کئے جائیں۔ ملک میں کم از کم میٹرک تک لازمی مفت تعلیم رائج کی جائے اور چائلڈ لیبر کا خاتمہ کیا جائے۔

۹۔ ذرائع ابلاغ کی اصلاح کی جائے۔ اسلامی تناظر میں نئی ثقافتی پالیسی وضع کی جائے جس میں فحاشی و عریانی کو فروغ دینے والے مغربی و بھارتی طحانہ فکر و تہذیب کے اثرات و رجحانات کو رد کر دیا جائے۔ صحافیوں کے لئے ضابطہ اخلاق تیار کیا جائے اور ان کی نظریاتی تربیت کی جائے۔ پرائیویٹ چینلز اور کیبل آپریٹرز کی مؤثر نگرانی کی جائے۔ اسلام اور پاکستان کے نظریاتی تشخص کے خلاف پروگراموں پر پابندی ہونی چاہئے بلکہ تعمیری انداز میں عوام کے اخلاق سدھارنے اور انہیں اسلامی تعلیمات پر عمل کی ترغیب دینے والے پروگرام پیش کیے جائیں اور صاف ستھری تفریح مہیا کی جائے۔

۱۰۔ پاکستان کی معیشت کو مضبوط بنانے اور افلاس اور مہنگائی کے خاتمے کے لیے ٹھوس عملی اقدامات کیے جائیں جیسے جاگیر داری اور سرمایہ دارانہ رجحانات کی حوصلہ شکنی کرنا، شعبہ زراعت میں ضروری اصلاحات کو اولین حکومتی ترجیح بنانا، تقسیم دولت کے نظام کو منصفانہ بنانا اور اس کا بہاؤ امیروں سے غریبوں کی طرف موڑنا۔ بیرونی قرضوں اور درآمدات کی حوصلہ شکنی کرنا اور زر مبادلہ کے ذخائر کو بڑھانے کے لیے مؤثر منصوبہ بندی کرنا۔ معاشی خود کفالت کے لئے جدوجہد کرنا اور عالمی معاشی اداروں کی گرفت سے معیشت کو نکالنا۔ سود اور اسراف پر پابندی اور سادگی کو رواج دینا۔ ٹیکسز اور محاصل کے نظام کو مؤثر بنایا جائے اور بینکوں کو پابند کیا جائے کہ وہ بڑے قرضوں کے اجراء کے ساتھ ساتھ مائیکرو کریڈٹ کا بھی اجراء کریں تاکہ غریب اور ضرورت مند لوگ ان بلا سود قرضوں کے ذریعے اپنی معاشی حالت بہتر کر سکیں نیز قرضوں کو بطور سیاسی رشوت دینے پر قانونی پابندی عائد کی جائے۔ زکوٰۃ اور عشر کی وصولی اور تقسیم کے نظام کو بہتر بنایا جائے۔ دستور پاکستان کے آرٹیکل 38 میں درج عوام کی معاشی اور معاشرتی فلاح و بہبود کے متعلقہ امور کی تکمیل کے لیے حکومت خود اور نجی شعبے کے اشتراک سے فوری طور پر ٹھوس اقدامات کرے

- ۱۰۔ لوٹ مار سے حاصل کردہ اور بیرون ملک بینکوں میں جمع خطیر رقم کی وطن واپسی کو یقینی بنایا جائے۔
- ۱۱۔ عدلیہ کی بالفعل آزادی کو یقینی بنایا جائے اور اسے انتظامیہ سے الگ کیا جائے۔ اسلامی تناظر میں نظام عدل کی اصلاح کے لئے قانون کی تعلیم، ججوں، وکیلوں، پولیس اور جیل سٹاف کے کردار کو اسلامی اصولوں سے ہم آہنگ کرنے کے لئے ضروری اقدامات کیے جائیں۔ انصاف سستا اور فوری ہونا چاہیے۔
- ۱۲۔ امن و امان کی بحالی اور لوگوں کے جان و مال کا تحفظ ریاست کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ حکومت کو ان مقاصد کے حصول کے لئے ہر ممکن قدم اٹھانا چاہئے۔
- ۱۳۔ خارجہ پالیسی کو متوازن بنایا جائے۔ تمام عالمی طاقتوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھے جائیں اور اپنی قومی خود مختاری کا تحفظ کیا جائے۔ اپنے ایٹمی اثاثوں کے تحفظ پر کوئی سمجھوتہ نہ کیا جائے۔ مسلمانان عالم کے رشتہ اخوت و اتحاد کو قوی تر کرنے کے لیے او آئی سی کو فعال بنانے میں پاکستان اپنا کردار ادا کرے۔
- ۱۴۔ افواج میں روح جہاد پیدا کرنے کے لئے سپاہیوں اور افسروں کی دینی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہونا چاہیے۔ بنیادی فوجی تربیت ہر مسلم نوجوان کے لئے لازمی ہونی چاہیے۔ فوجی افسروں کی اس غرض سے خصوصی تربیت کی جائے کہ ان کا فرض ملک کا دفاع ہے نہ کہ حکومت چلانا۔ بیوروکریسی کی تربیت بھی اسلامی تناظر میں ہونی چاہیے تاکہ ان کے ذہنوں میں یہ راسخ ہو جائے کہ وہ عوام کے خادم ہیں حکمران نہیں۔
- ۱۵۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لئے ایک آزاد اور طاقتور ریاستی ادارہ قائم کیا جائے جو ملک میں اسلامی معروفات اور نیکیوں کے فروغ اور منکرات و برائیوں کے خاتمے کے لئے کام کرے اور معاشرے میں ایسا ماحول پیدا کرے جس میں نیکی پر عمل آسان اور برائی پر عمل مشکل ہو جائے اور شعائر اسلامی کا احیاء و اعلاء ہو اور دستور کے آرٹیکل 31 میں جن امور کا ذکر کیا گیا ہے ان پر مؤثر عمل درآمد ہو سکے۔ دفاع اسلام خصوصاً اسلام کے بارے میں شکوک و شبہات کے ازالے اور مسلمانوں و غیر مسلموں تک مؤثر انداز میں دین پہنچانے کے لئے بھی حکومت پاکستان کو فنڈز مختص کرنے چاہئیں اور وسیع الاطراف کوششیں بروئے کار لانی چاہئیں۔

## فہرست علماء کرام جنہوں نے نفاذ شریعت کے متفقہ ۱۵ نکات کی منظوری دی ☆

- 1- مولانا مفتی محمد خان قادری (مہتمم جامعہ اسلامیہ، لاہور)
- 2- پیر عبدالحق قادری (صدر مرکزی جماعت اہل سنت پاکستان)
- 3- علامہ احمد علی قصوری (امیر مرکز اہل سنت، لاہور)
- 4- صاحبزادہ علامہ محبت اللہ نوری (مہتمم جامعہ حنفیہ فریدیہ بصیر پور، اوکاڑہ)
- 5- علامہ قاری محمد زوار بہادر (ناظم اعلیٰ، جمعیت علماء پاکستان، لاہور)
- 6- مولانا حافظ غلام حیدر خادی (مہتمم جامعہ رحمانیہ رضویہ، سیالکوٹ)
- 7- مولانا مفتی شیر محمد خان (صدر دارالافتاء دارالعلوم محمدیہ غوثیہ، بھیرہ [ضلع سرگودھا])
- 8- علامہ حسان الحیدری (حیدر آباد، سندھ)
- 9- مولانا راغب حسین نعیمی (مہتمم جامعہ نعیمیہ، لاہور)
- 10- مولانا خان محمد قادری (مہتمم جامعہ محمدیہ غوثیہ، داتا گٹر، لاہور)
- 11- مولانا محمد خلیل الرحمن قادری (ناظم اعلیٰ جامعہ اسلامیہ، لاہور)
- 12- علامہ محمد شہزاد مجیدی (سربراہ دارالخلاص - مرکز تحقیق، لاہور)
- 13- علامہ محمد بوستان قادری (شیخ الحدیث دارالعلوم محمدیہ غوثیہ، بھیرہ [ضلع سرگودھا])
- 14- سید منور حسن (امیر جماعت اسلامی پاکستان، منصورہ، لاہور)
- 15- مولانا عبدالمالک (صدر رابطہ المدارس الاسلامیہ، منصورہ لاہور)
- 16- ڈاکٹر فرید احمد پراچہ (ڈپٹی سیکرٹری جنرل جماعت اسلامی، منصورہ لاہور)
- 17- ڈاکٹر سید وسیم اختر (امیر جماعت اسلامی پنجاب، لاہور)
- 18- مولانا سید محمود الفاروقی (ناظم تعلیمات رابطہ المدارس الاسلامیہ، لاہور)
- 19- مولانا محمد ایوب بیگ (ناظم نشر و اشاعت تنظیم اسلامی پاکستان، لاہور)

☆ در اتحاد امت کانفرنس منعقدہ لاہور، مورخہ ۲۴ ستمبر ۲۰۱۱ء



- 20- مولانا ڈاکٹر محمد امین (ڈین صفاء اسلامک سنٹر، لاہور)
- 21- مولانا محمد حنیف جالندھری (ناظم اعلیٰ، وفاق المدارس العربیہ، ملتان)
- 22- مولانا مفتی رفیق احمد (دارالافتاء جامعۃ العلوم الاسلامیہ، علامہ بنوری ٹاؤن، کراچی)
- 23- مولانا حافظ فضل الرحیم (نائب مہتمم جامعہ اشرفیہ، لاہور)
- 24- مولانا زاہد الراشدی (ڈائریکٹر الشریعہ اکیڈمی، گوجرانوالہ)
- 25- مولانا عبدالرؤف فاروقی (ناظم اعلیٰ جمعیت علماء اسلام، لاہور)
- 26- مولانا محمد امجد خان (ناظم اطلاعات جمعیت علماء اسلام۔ لاہور)
- 27- مولانا مفتی محمد طاہر مسعود (مہتمم جامعہ مفتاح العلوم، سرگودھا)
- 28- مولانا مفتی محمد طیب (مہتمم جامعہ اسلامیہ امدادیہ، فیصل آباد)
- 29- مولانا ڈاکٹر قاری احمد میاں تھانوی (نائب مہتمم دارالعلوم الاسلامیہ، لاہور)
- 30- مولانا اللہ وسایا (عالیٰ مجلس تحفظ ختم نبوت، ملتان)
- 31- مولانا مفتی محمد گلزار احمد قاسمی (مہتمم جامعہ قاسمیہ، گوجرانوالہ)
- 32- مولانا قاری محمد طیب (مہتمم جامعہ حنفیہ بورے والا، وہاڑی)
- 33- مولانا رشید میاں (مہتمم جامعہ مدنیہ، کریم پارک، لاہور)
- 34- مولانا محمد یوسف خان (مہتمم مدرسۃ الفیصل للبنات، ماڈل ٹاؤن، لاہور)
- 35- مولانا عزیز الرحمن ثانی (مبلغ عالیٰ مجلس تحفظ ختم نبوت، لاہور)
- 36- مولانا رضوان نفیس (خانقاہ سید احمد شہید، لاہور)
- 37- مولانا قاری جمیل الرحمن اختر (مہتمم جامعہ حنفیہ قادریہ، لاہور)
- 38- مولانا حافظ محمد نعمان (مہتمم جامعہ الخیر جوہر ٹاؤن، لاہور)
- 39- مولانا قاری ثناء اللہ (امیر جمعیت علماء اسلام لاہور)
- 40- پروفیسر مولانا ساجد میر (امیر مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان، لاہور)
- 41- پروفیسر حافظ محمد سعید (امیر جماعت الدعوة پاکستان، لاہور)
- 42- مولانا حافظ عبدالغفار روپڑی (امیر جماعت اہل حدیث پاکستان، لاہور)
- 43- مولانا عبید اللہ عقیف (امیر جمعیت اہلحدیث پاکستان، لاہور)
- 44- مولانا سید ضیاء اللہ شاہ بخاری (ناظم اعلیٰ متحدہ جمعیت اہلحدیث پاکستان)
- 45- مولانا حافظ عبدالوہاب روپڑی (نائب امیر جماعت اہلحدیث پاکستان)
- 46- مولانا محمد شریف خان چنگوانی (نائب امیر مرکزی جمعیت اہلحدیث پاکستان)

- 47- پروفیسر محمد حماد لکھوی (خطیب جامع مسجد مبارک الہمدیث، اسلامیہ کالج، لاہور)
- 48- مولانا ڈاکٹر حسن مدنی (نائب مدیر جامعہ لاہور الاسلامیہ [رحمانیہ] لاہور)
- 49- مولانا امیر حمزہ (کنوینئر تحریک حرمت رسول [جماعت الدعوتہ] لاہور)
- 50- مولانا قاری شیخ محمد یعقوب (جماعت الدعوتہ، لاہور)
- 51- مولانا نازن نصر اللہ (امیر مرکزی جمعیت الہمدیث لاہور)
- 52- محمد زاہد ہاشمی الازہری (ناظم اعلیٰ جماعت غرباء الہمدیث، پنجاب)
- 53- علامہ ڈاکٹر محمد حسین اکبر (مہتمم ادارہ منہاج الحسین، لاہور)
- 54- علامہ حافظ کاظم رضا نقوی (تحریک اسلامی، اسلام آباد)
- 55- مولانا سید محمد مہدی (جامعہ المنظر، لاہور)
- 56- مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی (جامعہ دارالعلوم کورنگی، کراچی)
- 57- مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب (جامعہ دارالعلوم کورنگی، کراچی)

### بقیہ: دوہری شہریت کی شرعی حیثیت

ہم سمجھتے ہیں کہ جو کلمہ پڑھ کر ہم مسلمان ہونے کا اقرار کرتے ہیں یعنی لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ اس میں دوسرے خداؤں کی نفی پہلے کی ہے اور ایک اللہ کا ثبات بعد میں ہے لہذا ایک مسلمان کس طرح ایک ایسی غیر مسلم ریاست کی وفاداری کا غیر مشروط عہد کر سکتا ہے جس کے آئین و قوانین کفر پر مبنی ہوں۔ بظاہر یہ اس عہد کی نفی ہے جو ایک مسلمان لا الہ کا اقرار کرتے ہوئے کرتا ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اذ سباب من دون اللہ کے قوانین کی اطاعت کو ان کی عبادت قرار دیا تھا۔ لہذا ہماری رائے یہ ہے کہ ایک مسلمان کسی شرعی عذر کی بنا پر کسی کافر ملک میں وقتی طور پر تو جاسکتا ہے لیکن ایک ایسے ملک میں جا کر مستقل رہنا جہاں کا ماحول غیر اسلامی ہو اور جہاں اس کے اور اس کے اہل و عیال کے ایمان کو نمایاں خطرہ لاحق ہو اور کفر کے ماحول میں جذب ہو کر رہ جانے کا خدشہ ہو تو ایمانی غیرت کا تقاضا ہے کہ یہ خطرہ مول نہ لیا جائے۔

معروف مسلمان محقق ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا طرز عمل ہمارے سامنے ہے جو ساری زندگی فرانس میں رہے لیکن انہوں نے وہاں کی شہریت نہیں لی۔ اس لیے ہمارے رائے یہ ہے کہ اولاً ایک مسلمان کو محض دولت کی محبت میں اور صرف دنیاوی خوش حالی کی خاطر کسی غیر مسلم ملک میں جا کر نہیں رہنا چاہیے اور اگر کسی وجہ سے یہ ناگزیر بھی ہو تو وہاں کی شہریت نہیں لینی چاہیے اور اس طرح کا حلف نہیں اٹھانا چاہیے جس سے اس کے ایمان کی نفی ہوتی ہو اور اسے کافر اند آئین و قوانین کی پیروی پر مجبور ہونا پڑتا ہو۔ ہذا من عندنا و العلم عند اللہ

## قومی تعمیر نو - کیوں اور کیسے؟

آفاق فورم نے جمعہ ۲۰ جنوری ۲۰۱۳ء کو مدیر البرہان کو قومی تعمیر نو (Reconstruction of the Nation) کے موضوع پر خصوصی خطاب کی دعوت دی جس کے بعد سوال و جواب کی نشست بھی ہوئی۔ اس گفتگو کا خلاصہ درج ذیل ہے:

اگرچہ 'قوم' کی تعریف خود قابل غور بلکہ قابل نظر ثانی ہے جیسا کہ ہمارے سیاسی و مذہبی قائدین (جناب، اقبال، مودودی) ماضی قریب میں اس اصطلاح کے معاصر اطلاق میں صحیح اسلامی نقطہ نظر کو پروموٹ کرتے رہے ہیں لیکن اب ہم اس پر غور کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے۔

قومی تعمیر نو کی بنیاد فرد ہے کیونکہ قوم اور معاشرہ افراد ہی سے مل کر بنتا ہے اور معاشرے کی فلاح اور ریاست کا استحکام بھی فرد کی اصلاح پر ہی موقوف ہے۔ فرد کی صحیح خطوط پر ذہن سازی اور سیرت سازی کے تین بڑے ذرائع تعلیم، تربیت اور میڈیا ہیں۔ قرآن حکیم سے بھی ہمیں یہی رہنمائی ملتی ہے کہ لوگوں کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں خصوصاً آخری پیغمبر حضرت محمد ﷺ کو تعلیم کتاب و حکمت و تزکیہ ہی کا نسخہ عطا فرمایا تھا جس کا مطلب آج کی اصطلاح و اسلوب میں اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہمارے تعلیمی نظام میں قرآن و سنت (اور ان کے معاون علوم) کو مرکزیت حاصل ہونی چاہیے نیز عمرانی و سائنسی علوم بھی قرآن و سنت کی روشنی ہی میں مدون کیے جانے چاہئیں تاکہ وہ ان کی تعلیمات اور تقاضوں کے مطابق ہوں اور ان کے خلاف نہ ہوں۔ اسی طرح تعلیم اس طرح دی جانی چاہیے کہ طلبہ کی صحیح اسلامی تربیت ہو اور وہ کل کے اچھے مسلمان بن سکیں۔ میڈیا غیر رسمی تعلیم میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے اور عصر حاضر میں ذہن سازی اور تطہیر افکار میں موثر کردار ادا کرتا ہے لہذا اس کا مثبت استعمال بھی ضروری ہے اور اس کے غلط استعمال کو روکنا بھی ناگزیر ہے۔

تعلیم کا حاصل تزکیہ ہے یعنی تعلیم فرد کا عمل بن جائے اور وہ برضا و رغبت اسلامی تعلیمات کے مطابق اپنی زندگی گزارنے لگے۔ معاشرے و ریاست کی قوت اسلامی مقاصد کے لیے استعمال کرنے اور اس غرض سے ان کی اصلاح کے لیے براہ راست کوششیں کرنے اور سیاسی عمل میں حصہ لینے میں بھی کوئی حرج نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب تک ہم فرد کی ذہن سازی اور تعمیر سیرت پر توجہ نہیں دیں گے، بات آگے نہیں بڑھے گی اور اس کے لیے حکومتوں پر انحصار کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں بلکہ یہ کام موثر انداز میں پرائیویٹ سیکٹر میں آج بھی ہو سکتا ہے اور ہمیں ضرور کرنا چاہیے۔

## اصلاح فرد اور جذبہ انقلاب بلسلسلہ فکر ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم

البرہان (شمارہ دسمبر ۲۰۱۲ء) میں ہمارے شذرے بعنوان ”اصلاح فرد اور انقلاب - قصہ احمد جاوید اور ڈاکٹر اسرار احمد“ پر جناب ضمیر اختر خاں نے ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم کی قائم کردہ تحریک خلافت کے ترجمان ہفت روزہ ”مدائے خلافت“ (شمارہ ۲۲ تا ۲۸ جنوری ۲۰۱۳ء) میں تبصرہ کیا ہے اور احمد جاوید صاحب نے ڈاکٹر اسرار احمد کے اخلاص و اللہیت کی جو تعریف کی تھی اور ان کے جذبہ انقلاب کی جو اصولی حمایت کی تھی، اس پر تو اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے اور اہل تہذیب کو دعوت بھی دی ہے کہ وہ جذبہ جہاد و انقلاب کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کی فکر کے مطابق کام کریں لیکن جس بات کی طرف ہم نے ان کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی تھی، اس پر انہوں نے کوئی توجہ نہیں دی۔

ہمارے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ بلاشبہ جہاں ایک طرف فرد کی اصلاح اور تہذیب مطلوب ہے اور یہ اصلاح اور تہذیب جامع ہونا چاہیے یعنی ایسا کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی دونوں کے اسلامی مطالبات اور تقاضے پورے کرے، وہیں اجتماعی اصلاح کے طالبوں اور اجتماعی و ریاستی اداروں کے اسلامی تقاضوں کے مطابق کام کرنے کے خواہش مندوں (یعنی اقامت دین، حکومت الہیہ اور انقلاب اسلامی کے علم برداروں) کو بھی یہ بات سمجھنی چاہیے کہ وہ یہ کام کما حقہ اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک وہ فرد کی اصلاح اور تہذیب کا کام نہ کریں۔ اس حوالے سے ہم نے کہا تھا کہ ان دونوں دائروں میں کام کرنے والوں میں اصولاً کوئی فکری بعد نہیں ہے اور نہ ہونا چاہیے بلکہ دونوں میں باہمی تعاون اور انسجام ہونا چاہیے۔

اس کے ساتھ ہی ہم نے طرفین کو توجہ دلائی تھی کہ دونوں دائروں میں کام کرنے والوں کی بنیادی ضرورت یہ ہے کہ فرد کی ذہن سازی اور تعمیر سیرت و کردار کے لیے تعلیم و تربیت [اور میڈیا] کا استعمال وسیع پیمانے پر کیا جائے۔ اور جب آپ یہ کام کرنے اٹھیں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ جدید تعلیم اور دینی مدارس کا نظام تعلیم دونوں ناقص اور اصلاح طلب ہیں اور مذکورہ مقاصد کے لیے ضروری ہے کہ نظام تعلیم و تربیت کی اسلامی تشکیل نو کی جائے اور اس کے بعد اس کی کثرت و اشاعت کی طرف آیا

جائے (یہی وجہ ہے کہ البرہان موجودہ نظام تعلیم و تربیت کی اصلاح اور کثرت و اشاعت تعلیم بعد از اصلاح کا علمبردار ہے)۔

ہم ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم کے جانشینوں اور متوسلین سے دوبارہ عرض کریں گے کہ یہ کام اہم ہے اور ان کے انقلابی پروگرام کو تقویت دینے والا ہے۔ ہم کوئی انہیں ان کے راستے سے ہٹانے کی کوشش نہیں کر رہے بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ انقلاب (یعنی ریاستی کردار کی تبدیلی) کے لیے ضروری ہے کہ پہلے فرد کو بدلا جائے اور فرد کو بدلنے کی کوششیں وسیع پیمانے پر کی جائیں تاکہ اس کی ذہن سازی اور فکری تطہیر بلکہ اس کی تعمیر سیرت و کردار کا کام بڑے پیمانے پر ہو سکے..... اور جب تک یہ نہیں ہوگا انقلاب نہیں آ سکتا کیونکہ انقلاب تو انسانوں نے ہی لانا ہے اور آپ کو ان کی حمایت و کثرت مطلوب ہے لہذا تنظیم اسلامی اور تحریک خلافت کو مجوزہ اسلامی انقلاب لانے کے لیے سارے ملک میں تعلیم و تربیت [ومیڈیا] کے اداروں کا (بعد از اصلاح) وسیع نیٹ ورک قائم کرنا چاہیے تاکہ اس کے نتیجے میں اس کو بڑے پیمانے پر کارکن میسر آ سکیں اور عوامی حمایت مل سکے۔ امید ہے کہ تنظیم اسلامی کے رہنما اور سوچنے سمجھنے والے احباب اس امر پر غور فرمائیں گے۔

### جماعت اسلامی

ہماری اس تجویز کے مخاطب مولانا مودودیؒ کی فکر کے سب علم بردار ہیں (ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم نے اقامت دین اور اسلامی انقلاب کا تصور بھی انہی سے لیا تھا) اور ان کی سب سے بڑی اور نمائندہ تنظیم جماعت اسلامی ہے لیکن جماعت اب اتنی بڑی، وسیع، پختہ اور پرانی ہو چکی ہے کہ ہم جیسے طالب علموں کی بات سننے، سمجھنے اور کسی نئی تجویز پر غور کرنے کے لیے اس کے پاس وقت اور مزاج ہی نہیں ہے۔ رہے نام اللہ کا۔

## دوہری شہریت کا حلف خلافِ شریعت ہے

قرآن اکیڈمی جھنگ کے صدر اور ماہنامہ حکمت بالغہ کے مدیر جناب انجینئر مختار حسین فاروقی صاحب نے ۱۰ جنوری ۲۰۱۳ء کو ایک استفتاء ملی مجلس شرعی کو بھیجا جو سارے دینی مکاتب فکر کے علماء کرام کا ایک مشترکہ پلیٹ فارم ہے۔ مذکورہ استفتاء مجلس کے زیر غور ہے اور جب مشترکہ طور پر کوئی فیصلہ ہو جائے گا تو وہ استفتاء کنندہ اور پریس کو بھیجا دیا جائے گا۔ دریں اثناء معاملے کی اہمیت کے پیش نظر راقم اپنی رائے اہل علم کے سامنے غور و فکر کے لیے رکھ رہا ہے۔

محترم سائل نے امریکہ اور کینیڈا کے حلف کی انگریزی عبارت ارسال کی ہے اور کہا ہے کہ ”آپ سے درخواست ہے کہ اس عبارت کے مفہوم اور معانی پر شرعی لحاظ سے غور فرمائیں اور کلمہ شہادت پڑھنے اور اقرار باللسان کے حوالے سے رہنمائی دیں کہ آیا یہ حلف اٹھانے والا شخص مسلمان رہتا ہے یا نہیں؟“ حلف کی عبارتوں سے تین باتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں: ایک یہ کہ حلف اٹھانے والا ایک کافر ریاست سے غیر مشروط وفاداری کا عہد کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کافر ملک کے غیر اسلامی آئین، قوانین اور اقدار کی پاسداری کا اعلان کرتا ہے اور تیسرے یہ کہ وہ اس غیر مسلم ریاست کی حفاظت کی خاطر جان لڑا دینے کا عہد کرتا ہے۔

یہ تینوں باتیں اسلامی لحاظ سے خطرناک اور ناقابل قبول ہیں کیونکہ جمہور علماء کرام ایک مسلمان کے کسی غیر مسلم معاشرے میں جا کر عارضی طور پر رہنے کی (جیسے سفارت اور تجارت کے لیے) اجازت تو دیتے ہیں اور دارالاسلام میں نہ ہونے کی وجہ سے اس کے لیے بعض پابندیوں سے رعایتیں بھی دیتے ہیں لیکن یہ سب کچھ ایمان کی حفاظت سے مشروط ہے اور اگر دارالکفر میں جا کر ایمان خطرے میں پڑ جائے اور اسلامی اصول و اقدار پر عمل ممکن نہ رہے تو ظاہر ہے ایک مسلمان کے لیے یہ خسارے کا سودا ہے جو اسے نہیں کرنا چاہیے۔

ایک مسلمان کے لیے ایسے غیر اسلامی آئین، قوانین اور اقدار کی پاسداری کرنا کیسے ممکن ہے جو اسلامی اصول و اقدار کی مخالف ہوں اور ایک مسلمان کس طرح ایک کافر ریاست کے لیے جان لڑانے کا عہد کر سکتا ہے مثلاً اگر وہ ریاست جس کی شہریت وہ لے رہا ہے اگر کسی مسلمان ملک پر حملہ کر دے (جیسا کہ امریکہ و یورپی ممالک نے ماضی میں عراق اور افغانستان پر کیا ہے اور پاکستان پر اب بھی حملے ہو رہے ہیں) تو وہ کیسے ایک اسلامی ملک اور معاشرے پر حملے میں شریک ہوگا اور اس کے اسلام کی کیا حقیقت ہوگی؟ (باقی صفحہ ۳۲ پر)

## مسلم تہذیب کا زوال داخلی مسئلہ ہے جسے حل کر کے مغربی تہذیب کو پسپا کیا جاسکتا ہے

جب سے مغربی تہذیب کو مسلم تہذیب پر بالادستی حاصل ہوئی ہے تب سے مسلمان اہل علم و دانش مغربی تہذیب کی خرابیاں اور برائیاں مسلم معاشرے کو بڑے زور و شور سے بتا رہے ہیں اور سمجھا رہے ہیں لیکن اب تک مغربی تہذیب کی یلغار کو نہیں روک سکے۔ وہ مغرب زدہ مسلمانوں پر تاہز توڑ حملے کر رہے ہیں لیکن مغربی تہذیب کا اثر و نفوذ رُک نہیں رہا۔ ہندوستان میں جب انگریز کا اقتدار ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد جم گیا تو مسلمان اہل دانش کو فکر لاحق ہوئی کہ مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کا کوئی بندوبست کیا جائے کیونکہ مغلیہ دور کا نظام تعلیم ختم ہو چکا تھا اور انگریز نے وہ اوقاف ضبط کر لیے تھے جن پر اُس دور کی تعلیم و تربیت کا انحصار تھا۔ مسلمانوں پر جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد بڑے ظلم و ستم ڈھائے گئے۔ مسلمان علماء انگریز کا خاص نشانہ تھے۔ چنانچہ بعض بزرگوں نے پرانا مغلیہ دور کا نظام تعلیم شروع کر دیا جس کی مثال دارالعلوم دیوبند ہے۔ یہ ۱۸۶۶ء کی بات ہے۔ یہ نصاب ایسا تھا جس کی انگریز اور اُس کی حکومت کو ضرورت نہیں تھی۔ ایسی حالت میں مسلمانوں پر حکومت کی انتظامیہ، عدالتوں اور فوجی ملازمت کے دروازے بند ہو گئے۔ یہ نظام تعلیم صرف ایسے امام مسجد اور خطیب تیار کر سکتا تھا جو مسجدوں میں نماز پڑھا سکیں اور خطبہ دے سکیں۔ اس کے علاوہ اُن کا کوئی مصروف نہیں رہ گیا تھا۔ ان کا نصاب چونکہ فرسودہ ہو چکا تھا اس لیے یہ عصر حاضر کی نئی ضروریات کے متعلق عوام کی رہنمائی صحیح طریقے سے نہیں کر سکتے تھے۔ اس طرح عوام میں اور اُن میں بعد پیدا ہو گیا اور نئی ضروریات کے مطابق ایک نئے نظام تعلیم کی ضرورت تھی جس کو علماء پورا نہ کر سکے۔

اس تعلیم کی ضرورت کو بعض مسلمان اہل فکر و نظر نے محسوس کیا اور پھر ہندوستان کے مسلمانوں میں قدیم مدرسوں کی جگہ جدید تعلیم کے لیے نئی نئی اسلامیہ انجمنیں بنیں۔ ان اداروں نے ملک میں اسلامیہ ہائی سکول قائم کیے۔ مسلم ایسوسی ایشن علی گڑھ اور انجمن حمایت اسلام لاہور وجود میں آئیں۔ ان سکولوں نے مشنری سکولوں کے مقابلے میں مختلف ضلعوں اور شہروں میں سکول اور کالج قائم کیے۔ سرسید احمد خان اور اُن کے رفقاء نے اس سلسلے میں بڑا کام کیا لیکن یہ لوگ اپنے اداروں میں صحیح دینی تعلیم نہ دے سکے۔

اس طرح ان اداروں اور درس گاہوں کا ماحول اسلامی رنگ حاصل نہ کر سکا اور اس پر سیکولر تعلیم کا غلبہ ہو گیا۔ قدیم مدرسے اور جدید اسلامیہ درس گاہیں مغربی تہذیب کا اب تک صحیح طور پر مقابلہ نہیں کر سکیں۔ قدیم مدرسے مغربی فکر و نظر کا اس لیے مقابلہ نہیں کر سکے کہ انہوں نے گہری نظر سے اُس تہذیب کا مطالعہ نہیں کیا۔ ہمارے جدید اسلامیہ کالج اور یونیورسٹیاں اپنے ہاں اسلام کا گہرا مطالعہ اور تحقیق کرنے میں ناکام رہیں اس لیے اُن میں سیکولر طبقہ حاوی ہے اور دینی طبقہ اس میں قوت حاصل نہیں کر سکا۔ دونوں کی سوچ منفی تھی اس لیے اس کے مثبت نتائج حاصل نہیں ہو سکے۔

اہل مدرسہ عوام میں ایسا اسلامی لٹریچر اور ادب پیدا نہیں کر سکے جس کی مسلم عوام کو عصر حاضر میں ضرورت تھی۔ اس سلسلے میں صرف ایک ایسے عالم ہیں جنہوں نے قابل قدر لٹریچر تیار کیا ہے اور وہ جناب سید ابوالحسن علی ندوی کی شخصیت ہے۔ باقی کچھ فاضلین ہیں جنہوں نے جدید خطوط پر کام کر کے اہل علم کی پیاس بجھائی ہے لیکن وہ عوام میں مقبول نہیں۔ یہ کریڈٹ ندوۃ العلماء لکھنؤ کو جاتا ہے جس سے عام لوگوں نے فیض حاصل کیا ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے وسیع دینی لٹریچر جدید خطوط پر عوام کو پیش کیا جس سے میرے جیسے بہت سے جدید تعلیم یافتہ افراد نے کسب فیض کیا ہے۔ سید قطب اور محمد قطب نے عمدہ کتابیں عوام کی رہنمائی کے لیے پیش کی ہیں۔ ان سب فاضلین نے مغربی تہذیب کی خرابیوں پر بڑے عمدہ طریقے سے رہنمائی کی ہے لیکن ایک چیز جس کی کمی محسوس کی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ ان فاضلین نے مسلم تہذیب اور مسلم معاشرے کی خرابیوں، اُس کی برائیوں اور زوال اور انحطاط پر سیر حاصل تبصرہ نہیں کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے نظام تعلیم کی خرابیوں اور کوتاہیوں کا کوئی ازالہ نہیں ہوا اور ہمارے نظام تعلیم میں دین و دنیا کی تفریق قائم رہی۔

ہمارے نظام تعلیم میں دوئی اور مشویت موجود ہے۔ قدیم مدرسے قرون وسطیٰ کے نظام تعلیم کو چلا رہے ہیں اور عصر حاضر کے علوم و فنون سے نااہل ہیں۔ جدید یونیورسٹیاں تقریباً سب مسلمانوں ملکوں میں چل رہی ہیں اُن میں سیکولر اثرات بڑے طاقتور ہیں اور اسلامی علوم و فنون کا نصاب ایسا نہیں جو جدید علوم و فنون کے ماہر علماء تیار کر سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دونوں طریقہ ہائے تعلیم کے فاضلین میں کشمکش بلکہ آویزش اور مخاصمت جاری ہے۔ جب تک ہم تعلیم میں دین و دنیا کی تفریق ختم نہیں کریں گے ہم میں فکری انتشار ختم نہیں ہوگا۔ اس کے لیے ایک زبردست تحریک کی ضرورت ہے۔ ہماری نشاۃ ثانیہ شروع نہیں ہو سکتی جب تک ہم نظام تعلیم کی اصلاح کر کے دین و دنیا کی تفریق ختم کر کے مسلم معاشرے کو یک



سوئی عطانہ کریں۔ ہمارے معاشرے کی تفریق واضح نظر آتی ہے۔ ایک طرف آپ کو مسٹر ٹائپ مسلمان نظر آئیں گے تو دوسری طرف مولوی ٹائپ حالانکہ ہمیشہ سے مسلم معاشرے میں ایک ہی ٹائپ کے مسلمان نظر آتے تھے۔ مغربی تہذیب کے غلبے کے بعد یہ تفریق ہم میں داخل ہوئی۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہم اس کو کیوں نہیں روک سکے اور کیوں ایک سوئی حاصل نہیں کر سکے؟

### اسلام ایک مکمل دین ہے تو پھر خرابی کہاں ہے؟

اسلام قرآن مجید کے مطابق ایک مکمل دین ہے۔ اس دین کو مکمل کر کے اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں نے اپنی نعمت بنی نوع انسان پر تمام کر دی ہے اور مجھے یہ دین پسند ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دین میں کوئی کمی اور کوتاہی نہیں۔ اس دین کی برکت سے مسلمان ساری کمزوریوں اور خرابیوں کے باوجود ایک ہزار سال کے قریب سپر پاور ہے اور دنیا میں مقتدر قوت تھے اور قوموں کے امام بن کر رہے۔ جدید علوم و فنون کے ذریعے انسان نے جتنی ترقی کی ہے انسان کے لیے اس دین میں اُس کے لیے رہنما خطوط موجود ہیں۔ تعلیم و تربیت، اخلاق اور کردار سازی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی رہنمائی موجود ہے لیکن ہم قرآن و سنت سے صحیح استفادہ نہیں کر رہے۔

ہمارے اہل علم و دانش تعلیم و تعلم کے جدید ذرائع استعمال کر کے قوم کی ٹھیک رہنمائی نہیں کر رہے۔ قصے، کہانیاں، ناول اور افسانوں کا استعمال اغیار خوب کر رہے ہیں۔ ہم اوائل عمر میں ترقی پسندوں، کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں کے افسانے اور ناول پڑھتے رہے۔ ہمارے نوجوان بھی کچھ پڑھتے ہیں لیکن مسلمان اہل علم و دانش ایسا اچھا اور پاکیزہ لٹریچر اور ادب بہت کم تیار کر سکے ہیں۔ مغربی افکار کی خرابیاں روکنے کا یہ بہت اچھا طریقہ ہے۔ ٹیلی ویژن پر دین کی تبلیغ ایک بڑا طاقت ور ذریعہ ہے جسے ڈاکٹر ذاکر نانیک نے بڑے اچھے طریقے سے استعمال کیا ہے۔ اب ہمارے بعض فرقہ پرست اس میں داخل ہو گئے ہیں اور اتحاد کی بجائے ہم میں فرقہ بندی داخل کر رہے ہیں اور بعض حضرات لائٹیووں سے ٹیلی ویژن ابھی تک توڑ رہے ہیں۔ ہمارا ذہن ابھی تک منفی سوچ رکھتا ہے اور مثبت سوچ نہیں اپنا سکا۔ مثبت اور تخلیقی سوچ ہی افراد اور قوموں کو ترقی کی بلندیوں تک لے جاتی ہے۔

### اہل علم و دانش ہی معاشروں کو سنوارتے اور بگاڑتے ہیں

انسانی تاریخ کے مطالعے سے ثابت ہوتا ہے کہ قوموں کو بنانے اور بگاڑنے میں اصل طاقت اہل علم و دانش کی ہوتی ہے۔ حضور ﷺ کو معلم بنا کر بھیجا گیا تھا۔ اسی طرح سارے انبیاء معلم ہی تھے بادشاہت

تو صرف دو انبیاء کو ملی۔ جب بھی حکمرانوں میں خرابیاں داخل ہوئیں تو اُس کی اصلاح علماء نے کی اور اُن کو راہِ راست پر لائے لیکن جب علماء میں خرابی آگئی تو ساری قوم بگڑ گئی۔ ایک خرابی تو یہ ہے کہ علماء دنیا کی ہوس و لالچ میں آجائیں۔ دوسری خرابی یہ ہے کہ علماء میں دنیا کی ہوس اور لالچ تو داخل نہ ہو لیکن ان پر جمود طاری ہو جائے۔ جمود کا مطلب یہ ہے کہ اُن کی سوچ جم جائے۔ اُن کے ذہن کی فہم و فراست، بصیرت، عقل و خرد کی سارے توتیں غور و فکر سے عاری ہو جائیں۔ وہ اپنے بزرگوں کے غور و فکر کے خزانے کو لے کر اُس پر بیٹھ جائیں۔ جو علم و فضل انہوں نے حاصل کیا تھا اُس پر قناعت کریں، اُسی کو یاد کریں، اُسی کو رٹا لگا کر یاد کریں۔ اُن کی سوچ اور غور و فکر منہنی ہو جائے۔ صلیبی جنگوں کے بعد جب یورپ کے لوگ مسلم ملکوں سے واپس اپنے ملکوں کو گئے تو وہ مشرق وسطیٰ کے ملکوں کی ترقی اور خوش حالی دیکھ کر گئے۔ انہوں نے اندلس کی یونیورسٹیوں اور درس گاہوں سے نئے نئے علم و فنون حاصل کیے، اُن کا ذہن وسیع ہوا تو اُن میں اپنی خستہ حالی کو درست کرنے کی اُمنگ پیدا ہوئی تو پھر نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوا۔ اہل کلیسا کے پادری اپنے آپ کو متبرک اور پاک باز سمجھتے تھے جس نے کوئی اعتراض کیا وہ گردن زنی ٹھہرا۔ اس طرح ہزاروں لوگ پھانسی چڑھائے گئے اور ہزاروں جلاد دیے گئے۔ آخر لوگ کلیسا کے خلاف ہو گئے اور پھر مذہب کے خلاف ہو گئے۔ اس طرح مادہ پرستی اور سیکولرزم کا آغاز ہوا اور مغربی تہذیب میں مادہ پرستی نے گھر کر لیا۔

خلافت عثمانیہ کو ترکی میں یہی سانحہ پیش آیا۔ سترھویں صدی کے آخر میں خلافت عثمانیہ میں ہر قسم کی بے اعتدالی، بدعنوانی اور کرپشن در آئی اور خلافت عثمانیہ کو آسٹرو ہنگری اور روس سے کئی لڑائیوں میں شکست کھا کر ہزیمت اٹھانا پڑی تو بعض اہل علم و دانش اور اصحاب فکر و نظر نے اصلاح احوال کی کوشش کی لیکن مفاد پرست علماء اور جاہل صوفیہ نے مخالفت کی۔ اٹھارویں صدی سے لے کر انیسویں صدی عیسوی تک کئی سلاطین اور وزراء نے اصلاح کی کوشش کی لیکن روایت پرست علماء اور جاہل صوفیہ نے اصلاحات کو ناکام بنادیا۔ آخر جنگِ عظیم اول میں جب مغربی طاقتوں نے خلافت عثمانیہ کے حصے بخرے کر دیے تو ترکی میں ایک قوم پرست اور مادیت پرست طبقہ اُٹھ کھڑا ہوا اُس نے مصطفیٰ کمال پاشا کی قیادت میں مغرب کی قوموں کا مقابلہ کیا، خلافت ختم کر دی اور نام نہاد جمہوریت مصطفیٰ کمال پاشا کی قیادت میں قائم کر دی۔ ترکوں نے مصطفیٰ کمال پاشا کو اتاترک کا خطاب دیا۔ شریعت کے قانون ختم کر دیے گئے اور ترکی مذہب کے خلاف چل پڑا۔ اب بھی ہر مسلمان ملک میں روایت پرستوں اور جدیدیت پسندوں میں کشمکش جاری ہے۔

صدیوں سے مسلمان چار فقہوں پر عمل پیرا تھے۔ یہ چار مکاتب فکر مجتہدین نے اپنے شاگردوں کے مشورے سے شروع کیے تھے۔ چاروں مجتہدین ایک دوسرے کے شاگرد تھے اور ایک دوسرے کی نہایت عزت و احترام کرتے تھے لیکن بعد کی صدیوں میں اُن فقہوں کے مقلدین میں اختلافات اتنے شدید ہو گئے کہ اُن میں خونی جنگیں ہوئیں اور ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے اور قرآن و سنت کو بھلا بیٹھے۔ ان کے علاوہ اہل تشیع بھی ہیں جو کئی فرقوں میں تقسیم ہیں۔ مسلمانوں کی فرقہ بندی نے ان کو بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ مغربی قوموں نے ان کی ناچاقی اور فرقہ بندی سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ یہ اپنی فرقہ بندی کے باوجود اکٹھے رہنے کا ڈھنگ سیکھ لیں۔ آپس میں جزوی اور فروعی اختلافات پر مباحثے اور مناظرے نہ کریں بلکہ عدل و انصاف سے اپنے معاملات طے کر لیں۔ ان کو ہمیشہ اکٹھے رہنا ہے یہ کہیں جا نہیں سکتے اور نہ دوسرے مذاہب کے لوگ ان کو گوارہ کریں گے۔ ایران اور خلافت عثمانیہ کی مخالفت نے اُن کو سپر پاور سے گرا کر تیسرے درجے کے ملک بنا دیا ہے اس سے سبق حاصل کریں اور باقی مسلم معاشرے بھی غور کریں اور فرقہ بندی کے باوجود دل جل کر رہنے کا ڈھنگ سیکھیں۔

## مسلمانوں کی داخلی ابتری اور اس کا حل

مسلمانوں کی داخلی حالت دگرگوں ہے۔ اس میں مندرجہ ذیل معاملات حل طلب ہیں:

### ۱۔ فرقہ بندی کا حل سب سے ضروری ہے

سب سے پہلی ترجیح فرقہ بندی کے حل کی کرنی چاہیے اس کا اوپر بھی ذکر کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے اہل سنت اپنی فرقہ بندی ختم کر سکتے ہیں کیونکہ اُن میں کوئی اصولی اختلاف نہیں۔ اُن کے اختلافات جزوی ہیں جن کو زیادہ ہوادی گئی ہے..... اُن کی قرآن و سنت کی تعبیر اور تشریح میں کوئی خاص اختلاف نہیں۔ اگر نظام تعلیم کی اصلاح کر لی جائے تو یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ اُن کو قرآن و سنت پر اتحاد کر لینا چاہیے اور ہر گلی محلے میں تین تین چار چار مسجدیں بنانی چاہئیں۔ جو علماء اتحاد پر راضی ہوں انہیں ترقی دے کر مسجد کے ابتدائی مدرسوں یا مکتبوں میں اُستاد رکھ لیا جائے اس طرح خواندگی میں اضافہ ہوگا۔ پنجاب حکومت نے مسجد مکتب سکول کھولے تھے لیکن وہ منصوبہ بوجہ کامیاب نہیں ہو سکا۔ حفاظ کی تعلیم و تربیت کر کے انہیں گریجوایشن تک تعلیم دے کر محکمہ تعلیم میں نوکریاں دی جائیں۔ ایسے جامع ادارے کھولے جائیں جہاں سے موجودہ سکولوں اور مدرسوں کی بجائے ایک تیسرا رول ماڈل سکول سسٹم قائم

ہوسکے اور وہیں سے علوم اسلامی کے اساتذہ تیار ہوں جو وسیع النظر اور وسیع الخیال ہوں تاکہ مسلمانوں میں مثبت سوچ پیدا ہو اور معاشرہ ذہنی جمود سے نجات حاصل کرے۔

## ۲۔ مسلمانوں میں دوسرا مسئلہ قومیت کا ہے

جب ہم میں دینی حس کمزور ہوئی اور اسلام صرف نماز، روزے تک محدود ہو گیا تو ہم اپنے قوم قبیلے کی طرف لوٹے اور ہم میں قدیم جاہلیت عود کر آئی جس کو مغربی تہذیب نے نیا رنگ دیا ہے۔ وہ دونوں جنگیں لڑ کر اب تھک گئے ہیں اور قومیت سے اُکتا گئے ہیں لیکن مسلمان قوموں کو یہ قومیت کی دیوی تھا گئے ہیں۔ اس لیے بعض مسلمان قوموں نے اس کی پوجا شروع کر دی ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اُس کے نبی ﷺ نے تو ہمیں بھائی بھائی بنایا تھا لیکن ہم اس نعمت کو بھول کر اپنی اپنی ذیلی اور اپنی اپنی بین بجا رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم سب ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔ قوم پرست مسلمان غور کریں کہ قومیت نے ہمیں سوائے ذلت و خواری کے اور کیا دیا ہے؟

## ۳۔ خواندگی اور تعلیم و تربیت ہمارا تیسرا بڑا مسئلہ ہے

اصل میں خواندگی اور تعلیم و تربیت پہلا مسئلہ ہونا چاہیے اس لیے کہ خواندگی اور صحیح اسلامی تعلیم و تربیت درست ہوگی تو ہم فرقہ بندی اور قومیت کی خرابی سے بچ جائیں گے اور اس کی اصلاح کر لیں گے۔ تعلیم و تربیت کو ہمیں پہلی ترجیح رکھنا چاہیے۔ عوام اگر خواندہ ہو جائیں اور ان کی صحیح تعلیم و تربیت ہو تو ہم باقی مسائل کافی تیزی سے حل کر لیں گے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم کم از کم عرصہ مقرر کریں جو ہم میں سو فی صد خواندگی پیدا کر دے۔ اس کے لیے آئین میں کوئی دفعہ رکھنی چاہیے اور اس کا بجٹ قومی بجٹ کے علاوہ رکھا جائے۔

## ۴۔ خواتین کے حقوق کا مسئلہ

دورِ حاضر میں امت مسلمہ باقی مذاہب اور دنیا کی دیگر اقوام کے نزدیک خواتین کے حقوق کے مسئلے پر تنقید کا نشانہ بنی ہوئی ہے۔ مسلمان خواتین کے جو حقوق قرآن و سنت کے مطابق ہیں وہ مسلمان معاشرے میں کہیں نظر نہیں آتے۔ مسلمان عورتیں عموماً مسلمان معاشرے میں ناخواندہ ہیں اور ان کا پردہ روایت پرستوں کے مطابق اتنا سخت ہے کہ جس گھر کو اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ نے حرم بنایا تھا وہ قید خانہ بن گیا ہے۔ غیرت کے نام پر مسلمان عورتوں کا قتل عام جاری ہے اور غیرت کے نام پر ہر کسی نے

اپنے اپنے اصول اور قوانین بنا لیے ہیں۔ مسلمان عورتوں میں بعض جگہ خواندگی دس فی صد سے زیادہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ نے عورت اور مرد کو شادی سے پہلے ایک دوسرے کو دیکھنے کی آزادی دی تھی لیکن یہ حق نہ شادی سے پہلے لڑکے کو دیا جاتا ہے اور نہ لڑکی کو، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دلال اور چولن عورتوں کا باقاعدہ ایک ادارہ بن چکا ہے جو مسلم آبادیوں میں رشتوں کا بندوبست کرتی پھرتی ہیں۔ یہ ان پڑھ عورتیں غریب طبقے سے تعلق رکھتی ہیں اور پیسے بٹورنے کے لیے دونوں خاندانوں کو مبالغہ آمیز اطلاعات دیتی ہیں۔ کیا اس خرابی کا کوئی علاج مسلمان علماء کر سکتے ہیں؟ چودہ سو سال گزرنے کے بعد بھی ہم اس کا علاج نہیں کر سکے۔

مولانا مودودی نے ایک کتاب ”پردہ“ لکھی ہے جس میں پردے کے متعلق اسلام کا نظریہ پیش کیا گیا ہے کہ پردہ کیوں ضروری ہے۔ کتاب بڑی تحقیق کے بعد لکھی گئی ہے اور مغربی تہذیب کی خرابیوں، بے اعتدالیوں اور خانگی تعلقات کے نقائص ظاہر کیے گئے ہیں۔ مولانا مودودی کہتے ہیں:

”انسانی تمدن کے سب سے مقدم اور سب سے زیادہ پیچیدہ مسئلہ دو ہیں جن کے صحیح اور متوازی حل پر انسان کی فلاح و بہبود اور ترقی کا انحصار ہے جن کے حل کرنے میں قدیم ترین زمانے سے لے کر آج تک دنیا کے حکماء و عقلا پریشان و سرگرداں رہے ہیں۔ پہلا مسئلہ یہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں مرد اور عورت کا تعلق کس طرح قائم کیا جائے کیوں کہ یہی تعلق دراصل تمدن کا سبب بنیاد ہے اور اس کا حال یہ ہے کہ اگر اس میں ذرا سی بھی ٹیڑھ آجائے تو تاثر یا می دود دیوار کجج۔ اور دوسرا مسئلہ فرد اور جماعت کے تعلق کا ہے جس کا تناسب قائم کرنے میں اگر ذرا سی بے اعتدالی بھی باقی رہ جائے تو صدیوں تک عالم انسانی کو اس کے تلخ نتائج بھگتنا پڑتے ہیں۔“ (صفحہ ۱۵)

اس سے آگے بڑھ کر نقطہ عدل کی بات کرتے ہیں۔ یہی نقطہ عدل ہے جس سے اہل مذاہب ہٹ کر اپنی تعبیروں اور تفسیروں میں گم ہو جاتے ہیں۔ ظلم و ستم جاری رہتا ہے اور اہل علم و دانش نقطہ اعتدال کی طرف نہیں آتے۔ مولانا مودودی کہتے ہیں:

”امام محمد بن سیرین نے حضرت عبیدہ بن سفیان بن الحارث الحضرمی سے دریافت کیا کہ اس حکم پر عمل کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ انہوں نے چادر اوڑھ کر بتایا اور اپنی پیشانی، ناک اور آنکھ کو چھپا کر صرف ایک آنکھ کھلی رکھی۔“ (صفحہ ۲۴)

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان جس کی آبادی ۹۰ فی صد مسلمانوں کی ہے وہ اس پردے پر کہاں تک صدیوں سے عمل کر رہے ہیں؟ پاکستان کا مزدور طبقہ جوشہروں اور دیہات میں رہتا ہے۔ وہ اس پر عمل پیرا نہیں ہے۔ جب گھر سے نکلتی ہیں تو ان کی عورتیں اپنے سر اور جسم کو چادر سے ڈھانپ لیتی ہیں۔ وہ اپنے مردوں کا کھیتوں اور کھلیانوں میں اور مزدوری کی جگہ پر ہاتھ بٹاتی ہیں۔ ان کے لیے مولانا مودودی صاحب اور ان کے ہم خیال علماء نے کوئی حل پیش نہیں کیا۔ مولانا مودودی کا تعلق ایک مذہبی علمی گھرانے سے تھا جو پردہ وہ تجویز کر رہے ہیں وہ اُمر اور مال دار گھرانوں کے لوگ یا علمی مذہبی گھرانوں کے لوگ کر سکتے ہیں جن کو عموماً خدمت گار اور نوکریں ہوتے ہیں جن کی تعداد مشکل سے دس فی صد ہوگی۔ باقی لوگوں کے لیے علماء نے کبھی زحمت گوارا نہیں کی کہ ان کو بتائیں آیا ان کا پردہ بغیر چہرے کے جائز ہے یا نہیں؟ اس مزدور طبقے کا مغربی تہذیب سے کوئی تعلق نہیں، وہ اپنی غربت کی وجہ سے ان پڑھ اور ناخواندہ ہیں، ان کے لیے چہرے کا پردہ شدید مسائل پیدا کرتا ہے۔ کوئی ہے جو ان کی رہنمائی کرے؟

##### ۵۔ وضع قطع اور لباس کا مسئلہ

پرانے زمانے میں قومیں اور قبیلے یا تو اپنے رسم و رواج کے مطابق اپنی وضع قطع قائم رکھتے تھے یا عموماً آب و ہوا کے مطابق لباس پہنتے تھے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کفار کے مخالف اپنا لباس اور وضع قطع رکھو۔ اس طرح مسلمانوں نے اپنی وضع قطع اور لباس میں منفرد اسلوب یا سٹائل رکھا۔ یہ انفرادیت کے لیے ایک حکم تھا۔ اس طرح مسلمان اپنی وضع قطع سے علیحدہ پہچانے جاتے تھے۔ مروجہ زمانہ سے بعض شدت پسندوں نے اپنی اپنی وضع قطع بنالی ہے۔ آنحضرت ﷺ نہایت نفیس طبیعت رکھتے تھے جیسا کہ اللہ کے نبی کو ہونا چاہیے۔ آپ ﷺ نے ایک صحابی کے الجھے ہوئے اور بد وضع بال دیکھے تو فرمایا ”اپنے بالوں کا اکرام کرو“۔ آپ ﷺ نے سادگی اور نفاست کو اپنی زندگی کا اسلوب بنایا۔ مسلمانوں کی وضع قطع اور لباس کی سادگی اور نفاست دوسری قوموں کے لیے رومال ماڈل ہونی چاہیے۔

##### اُمت اسلامیہ قوموں کی امام اور غیر مسلموں کے لیے رول ماڈل ہے

مسلمان اللہ تعالیٰ کا کارکن اور اُس کی فوج کا سپاہی ہے۔ وہ غیر مسلموں کے لیے رومال ماڈل ہونا چاہیے۔ مسلمانوں کی وضع قطع، لباس اور پوشاک، طریق بود و باش، اخلاق اور کردار مثالی ہونا چاہیے لیکن

اب ان کی وضع قطع نہایت بھدی اور بد وضع ہے۔ بعض کی داڑھیاں اتنی زیادہ بڑھی ہوتی ہیں کہ بھلی نہیں لگتیں۔ اللہ کے نبی ﷺ کی سنت کی اتباع میں نفاست کا خیال رکھنا چاہیے۔ مسلمانوں کا اخلاق اور کردار صحابہ رسول کے اخلاق کا نمونہ ہونا چاہیے۔ شخصیت نفاست اور سادگی کا نمونہ ہو۔ غیر مسلم قومیں چونکہ خوش حال اور ترقی یافتہ ہو گئی ہیں اس لیے وہ اپنی وضع قطع اور لباس کا خاص خیال رکھتی ہیں۔ اس کے مقابلے میں مسلمان اپنی سادگی اور نفاست کو چھوڑ چکے ہیں اور اس معاملے میں لا پرواہ ہیں۔ جس کو دنیا میں امامت اور قیادت کا مقام عطا ہوا ہو اس کو ہر معاملے میں رول ماڈل ہونا چاہیے۔

### مسلم تہذیب کی داخلی ابتری اور مغربی تہذیب کا جاہ و جلال

مسلمان مفکرین اور دانشور اپنی کتابوں میں بڑی حد و مد سے لکھتے ہیں کہ مغربی تہذیب تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے اور وہ بڑی جلدی برباد ہو جائے گی۔ مغربی تہذیب کی بربادی میں تو کوئی شک نہیں مگر فی الحال وہ ساری دنیا پر حکمران ہے۔ اگرچہ اس کی بربادی کے آثار ظاہر ہونا شروع ہو گئے ہیں لیکن اس کا جاہ و جلال ابھی تک قائم ہے اور جب تک اس کا کوئی متبادل سامنے نہیں آتا وہ قائم رہے گی اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کتنی صدیوں تک قائم رہے گی؟ بہر حال ابھی تک مسلم تہذیب داخلی طور پر ابتری کا شکار اور خود برباد اور خستہ حال ہے اور ہم دوسروں کو بربادی سے ڈراتے ہیں۔ ہمارے مسلمان مفکرین جس آب حیات کی دنیا کو اور خاص طور پر مغربی تہذیب کو نوید سناتے ہیں وہ آب حیات اسلام ہے۔ اس آب حیات سے خود اہل اسلام محروم ہیں۔ یہ آب حیات ان کے پاس ہے بلکہ سامنے رکھا ہوا ہے لیکن اس کو پیٹے نہیں ہیں۔ کیا ۱۵ آزاد مسلم ممالک میں اسلام کہیں صحیح اور اصلی شکل و صورت میں قائم ہے؟ پاکستان کو لے لیں اس ملک کو بنے ۶۴ سال ہو گئے ہیں لیکن ہم اپنی عظیم اکثریت کے باوجود اسلامی قانون قرآن و سنت کے مطابق قائم نہیں کر سکے۔ جب ہم خود اسلام پر عمل پیرا نہیں تو غیر مسلموں اور مغرب کے لوگوں کو اسلام کا کیا پیغام پیش کر سکتے ہیں؟

اس کا ایک ہی صحیح حل ہے اور وہ یہ کہ ہم داخلی حالت کو درست کریں۔ نظام تعلیم کی اصلاح کریں اور قوم کی صحیح خطوط پر تعلیم و تربیت کریں اور خواندگی کو عام کریں۔ ہر مسلمان بلکہ ہر پاکستانی کو خواندہ بنادیں۔ ہر پاکستانی کو ہنرمند بنادیں تاکہ وہ اپنی روزی حلال طریقے سے کماسکے۔ ایک ہی قومی نصاب ہو اور نظام تعلیم میں دین و دنیا کی تفریق ختم کر دیں اور قوم کی تعلیم و تربیت صرف قرآن و سنت پر ہو۔ قوم میں یک سوئی پیدا کریں تب ہی ہم مغربی تہذیب سے چھٹکارا حاصل کر سکیں گے۔

## جدید دور میں جنگ کا نیا تصور اور جہاد فی سبیل اللہ

جدید دور میں قوموں کے درمیان جنگ کا تصور بالکل بدل گیا ہے۔ پرانے زمانے میں جب قوموں میں اختلافات بڑھ کر خاصیت اختیار کر لیتے تھے تو پھر حکمران یا بادشاہ میدان جنگ میں تیر کمان، نیزے اور تلواروں سے لڑ کر اپنی فوجوں کی قوت سے دشمن کو مغلوب کر کے اور فتح حاصل کر کے کامیاب ہوتے تھے۔ پھر ترقی ہوئی تو خود کار رائفلیں، مشین گنیں، توپیں اور ٹینک میدان جنگ میں آ گئے، پھر جنگی ہوائی جہاز، جنگی بحری جہاز اور آب دوزیں آ گئیں۔ جس کے پاس یہ ہتھیار زیادہ ہوتے تھے اور اُس کی فوجیں زیادہ تربیت یافتہ اور قومی لگن رکھتی تھیں وہ میدان مار لیتی تھیں لیکن اب جدید دور میں پراپیگنڈے، ڈپلومیسی اور معاشی جنگ سے قوموں کو شکست دی جاسکتی ہے۔ اس کو سرد جنگ (cold war) کہا جاتا ہے۔ ہمارے دور میں امریکہ نے اسی طریقے سے اپنے دشمن سوویت روس کو شکست دی۔ سوویت روس امریکہ سے پراپیگنڈے، ڈپلومیسی اور معاشی ٹوٹ پھوٹ کی وجہ سے شکست کھا گیا اور امریکہ کو اپنی فوجیں استعمال نہیں کرنا پڑیں اور وہ بغیر لڑے اپنے دشمن پر غالب آ گیا اور فتح حاصل کر لی۔

انیسویں صدی میں جب جاپان کو امریکہ نے تجارت پر مجبور کر کے اُس سے من مانی شرطیں منوائیں، اُس وقت پوری جاپانی قوم نے سوچا کہ ہم میں کیا خرابی ہے جو ہم شکست کھا گئے ہیں۔ اُن کا قدیم زمانے سے یہ نظریہ تھا کہ کسی دوسری قوم سے کوئی تعلق نہ رکھو، نہ کسی قوم سے لین دین اور تجارت کرو۔ اس طرح وہ اپنے خول میں بند ہو گئے۔ وقت آنے پر یہ حکمت عملی کام نہ آئی اور امریکہ کے چند لوہے کے بحری جہازوں نے جاپان کی قومی بحریہ کو، جو لکڑی کے جہازوں اور کشتیوں پر مشتمل تھی، چند گھنٹوں میں تباہ کر دیا اور وہ گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گیا۔ آخر پوری قوم نے سوچا کہ ہم کیوں ہزیمت اٹھانے پر مجبور ہوئے ہیں تو انہیں معلوم ہوا کہ ہم زمانے سے کافی پسماندہ رہ گئے ہیں۔ انہوں نے اپنے نوڈیورپ اور امریکہ بھیجے، حالات کا مطالعہ کیا اور اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کا محاسبہ کیا۔ امریکی بحریہ کے کموڈور پیری نے انیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں جاپانی بحریہ کو تباہ کیا تھا۔ جاپانی قوم نے سب سے پہلے اپنی تعلیمی کمزوری کو دور کیا اور دس سال کے قلیل عرصے میں ساری قوم کو خواندہ بنا دیا۔ پھر تیس چالیس سال کے عرصے میں اس قوم نے اتنی ترقی کی کہ وہ جدید ترقی یافتہ قوم بن گئی۔ ۱۹۰۵ء میں روس اور جاپان کی کسی تنازعے پر جنگ ہوئی تو جاپان نے روس کو وولادی واسٹک کے مقام پر شکست دی۔ تقریباً دو سو سال کے بعد یہ پہلا موقع تھا جب ایک ایشیائی ملک نے ایک مغربی قوم کو فیصلہ کن شکست دی۔ اس طرح پہلی جنگ



عظیم تک جاپان ایک جدید ترقی یافتہ ملک بن گیا۔

دوسری مثال چین کی ہے۔ چین کسی زمانے میں ایک ترقی یافتہ ملک اور تہذیب و تمدن تھا۔ زمانے کے نشیب و فراز سے وہ زوال اور انحطاط کا شکار ہو گیا۔ بیسویں صدی کے وسط میں وہاں کمیونسٹ انقلاب آیا۔ بے شمار لوگ مارے گئے لیکن ملک کی حالت نہ بدل سکی۔ آخر کمیونسٹ پارٹی نے آزاد تجارت اور سرمایہ داری کے اصول اپنا کر ترقی کا راستہ اختیار کیا اور تیس سال میں اتنی معاشی ترقی کی ہے کہ چین اب امریکہ کے بعد دنیا کی دوسری بڑی طاقت ہے۔

کیا ہم ان مثالوں سے جنگ کے نئے طریقے سیکھ کر جہاد فی سبیل اللہ شروع نہیں کر سکتے؟ جہاد کی تیاری کے لیے ہمیں داخلی اصلاح کی ضرورت ہے۔ ہم میں جاہلیت قدیمہ زیادہ طاقتور ہے۔ ہم میں قبیلے اور ذات پات کے رسم و رواج اور برادری سسٹم زیادہ مضبوط ہے۔ جب وراثت کی تقسیم کا وقت آتا ہے تو ہم قرآن و سنت پر کتنا عمل کرتے ہیں؟ بیاہ شادی کی رسوم میں ہم دین اور شریعت کا کتنا خیال کرتے ہیں؟ ہماری خواندگی کی شرح کتنی ہے؟ کیا آدھی قوم جاہل اور ناخواندہ نہیں؟ ہم میں صحیح اسلامی تعلیم کی شرح کتنے فی صد ہوگی؟ جب تک ہم داخلی حالت درست نہیں کرتے ہم ترقی کی طرف ایک قدم نہیں بڑھا سکتے۔ خواندگی کے بعد ہمیں ایسے علما اور اہل علم و دانش تیار کرنے چاہئیں جو عصر حاضر کے مطابق تہذیب مغرب کا مقابلہ برابر کی چوٹ پر کر سکیں۔ ہم سائنس اور ٹیکنالوجی میں کتنے پسماندہ ہیں؟ اس پر غور فرمائیں۔ یونیورسل خواندگی، قوم کی جامع اور جدید علما سے تعلیم و تربیت، سائنس اور ٹیکنالوجی میں باقی قوموں سے زیادہ مجاہدانہ محنت ہمیں قوموں کا قائد اور امام بنا سکتی ہے۔ ہم جدید جاہلیت کا مقابلہ جہاد کی صحیح طریقے سے تیاری سے کر سکتے ہیں۔ انہوں نے سائنس اور ٹیکنالوجی کے زور سے ہمیں مغلوب کیا ہے، ہمیں اُن کے خلاف یہی ہتھیار استعمال کرنا ہوگا۔

### راہِ نجات

سید قطب شہید نے عربی میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا ترجمہ جناب ساجد الرحمن صدیقی نے کیا ہے جس کا نام ’اسلام اور مغرب کے تہذیبی مسائل‘ ہے۔ یہ ایک عمدہ کتاب ہے جس میں سید قطب نے لکھا ہے کہ انسان کے لیے راہِ نجات صرف اسلام میں ہے۔ مغربی تہذیب کو اس راہِ نجات کی ضرورت ہے اور اس راہِ نجات کی طرف مغرب کے لوگ تب آئیں گے جب اُن کو اس راہِ نجات کا عملی نمونہ نظر آئے گا اور وہ اُسے محسوس کر سکیں گے، وہ کہتے ہیں:

”انسانیت کبھی بھی ایسے ضابطہ زندگی کو تسلیم نہیں کرتی جو سنا سنایا ہو یا جسے صرف مطالعہ کیا جاسکے۔ انسانیت اس منہاج کو تسلیم کرتی ہے جو زندہ اور متحرک ہو۔ اپنی مجسم شکل میں انسانوں کی ایک جماعت میں عملاً جلوہ گر ہو۔ اسے آنکھیں دیکھ سکیں، اسے ہاتھ چھو سکیں اور اس کے آثار عقل محسوس کر سکے۔ انسانیت اگر اسلامی منہاج زندگی کو اپنا سکتی ہے تو وہ اسے ایک اسلامی معاشرے میں جلوہ گرد دیکھ کر ہی اپنا سکتی ہے۔“ (صفحہ ۱۸۹)

اس وقت ہمارے سامنے نفاذ اسلام کے تین اسلامی ماڈل ہیں: ۱- طالبان کا ماڈل ۲- ایرانی ماڈل اور ۳- سعودی عرب کا ماڈل۔ کیا ان میں کوئی ایسا ہے جو صحیح الفکر مسلمان کو قبول ہو؟ جب مسلمانوں کو یہی ماڈل پسند نہیں تو غیر مسلم اسلام کو کس طرح پسند کریں گے؟ یہ دور ایسا ہے جس میں کوئی جاہل اور مطلق العنان گروہ اگر کسی قوم کی گردنوں پر شریعت کے نام پر سوار ہو جائے تو کیا ملتِ مسلمہ اُسے قبول کر لے گی؟ اس وقت ہمیں ایسے اہل علم و دانش کی ضرورت ہے جو ساری اُمتِ مسلمہ کے سامنے قرآن و سنت کا اسلام پیش کریں اور یہ گروہ دین پر اور جدید علوم و فنون پر پوری دسترس رکھتا ہوتا کہ مغرب کے علما کا مقابلہ ہر میدان میں کر سکے۔ وہ اسلامی علوم و فنون کے علاوہ جدید عمرانی اور سائنسی علوم و فنون پر مغرب کے ہم پلہ بلکہ ان سے بڑھ کر ہوں۔ فرقہ بندی پر وقت ضائع نہ کریں اور فرقہ بندی کے ساتھ ساتھ مل جل کر رہنے کا ڈھنگ سیکھیں اور آپس میں جذبات پر مباحثوں میں وقت ضائع نہ کریں۔ ایسے وسیع الخيال، وسیع الظرف اور وسیع النظر اہل فکر و دانش ہی مسلم تہذیب کو سپر پاور بنا سکتے ہیں۔ ایسا جہاد فی سبیل اللہ ہمیں کامیابی سے ہمکنار کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارا حامی و ناصر ہو۔

## ایمان اور ٹیکنالوجی

محترم ڈاکٹر محمد امین صاحب

السلام علیکم! میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھ ایسے کم علم اور غیر معروف آدمی کے ذمہ بے صدا کو البرہان ایسے قابل احترام مجلہ میں جگہ دی۔ تقریباً ایک ماہ پہلے فون پر ایک آپ نے خالد جمعی صاحب کے اس شکوے کا ذکر فرمایا تھا کہ میرے مضمون میں ان کی تحریروں کے حوالہ جات نہیں ہیں تو اس نے مجھے اندر سے مضطرب اور متنبہ کر دیا کہ آپ جیسی مخلص اور صاحب علم شخصیت جمعی صاحب کے ”سیاسی“ بیان کو اہمیت دے رہی ہے تو مجھے بھی زیادہ محتاط ہو کر اپنی شائع شدہ سوچ پر تنقیدی نگاہ ڈالنی چاہیے اور جمعی صاحب کے افکار کا دوبارہ زیادہ تفصیلی مطالعہ کرنا چاہیے۔ میں نے خود احتسابی کے جذبہ کے تحت پوری دلچسپی اور ثابت قدمی سے جناب خالد جمعی صاحب کے افکار و خیالات کا بذریعہ ماہنامہ ”ساحل“ مطالعہ شروع کر دیا۔ کئی صفحات کا تفصیلی مطالعہ میرے مضامین میں بیان کیے گئے مرکزی خیال کو تبدیل تو نہیں کر سکا، ہاں اسے موکد ضرور کر گیا ہے۔ اگر دل نے آمادہ کیا اور وقت نے مہلت دی تو اس تفصیلی مطالعے کی روداد بھی شاید گرفت میں آجائے۔ میں مسلسل اس سوچ میں تھا کہ میں اپنے اس حاصل مطالعہ کو کیا نام دوں کہ پچھلے دنوں فیس بک پر جناب اور یا مقبول جان کے صفحے پر کسی دانشور کے دو اقوال نظر سے گزرے اور مجھے ایسے لگا شاید کہ مجھے اپنے مطالعہ کے نتیجے میں جس سوال کے جواب کی جستجو تھی وہ مجھے کسی حد تک مل گیا ہے۔ میں اپنی ٹوٹی پھوٹی یادداشت کے زور پر یہ دونوں اقوال تحریر کر رہا ہوں۔

1-An uneducated person, who has common sense, is thousand time better than an educated person who has no common sense.

دوسرا قول بھی انگریزی میں تھا لیکن مجھے الفاظ یاد نہیں آ رہے تاہم اس کا مفہوم کچھ یوں تھا کہ ”سب کچھ جاننے کا زعم بھی جہالت ہے“۔

یہ دونوں اقوال کسی حد تک میرے پچھلے ایک ڈیڑھ ماہ سے مطالعہ کیے گئے مواد پر صادق آتے ہیں۔ تاہم جمعی صاحب کو یہ کریڈٹ ضرور جاتا ہے کہ انہوں نے سائنس اور ٹیکنالوجی پر تنقیدی سوچ کا شد و مد سے اظہار کیا۔

اس عاجز نے سائنس مخالفت کے تناظر میں اپنے نقطہ نظر کا ایک بار پھر تنقیدی جائزہ لیا۔ اس جائزہ کے دوران مجھے یاد آیا کہ میں اپنے ایک پرانے مضمون میں سائنس پر تنقید بھی کی تھی، جو میں نے ”تورا بورا“ کے واقعے کے بعد روزنامہ جنگ میں جاوید چودھری صاحب کے کالم کے جواب میں تحریر کیا تھا۔ جاوید صاحب کا کالم جنگ کے شکریہ کے ساتھ روزنامہ اسلام میں شائع ہوا۔ ان دنوں اتفاق سے روزنامہ اسلام کے چیف ایڈیٹر ملتان آئے ہوئے تھے۔ میں نے اپنا جوابی مضمون روزنامہ اسلام میں شائع کرانے کے لیے ان سے ملاقات کی۔ انہوں نے سرسری نظر سے میرے مضمون کو دیکھا، اور شائع کرنے سے معذرت کر لی۔ روزنامہ اسلام کے چیف ایڈیٹر نے فرمایا کہ ایمان کی تکرار سے تو ایمان نہیں آجاتا۔ یہ جملہ بڑے ہلکے پھلے انداز میں کہا گیا لیکن مجھے بے حد شرمندگی ہوئی کہ ایمان ایمان کی تکرار کرنے سے واقعتاً تو ایمان نہیں آجاتا۔ ایمان کی سچی آبیاری کی ایک شدید تڑپ کے ساتھ میں نے اپنے آپ کو ایک لقمہ ووق صحر میں محسوس کیا۔ خیر..... شاید ایک اور رائے لینے کی نیت سے میں ماہنامہ احرار کے مدیر سید معاویہ شاہ بخاری (پوتے حضرت عطا اللہ شاہ بخاریؒ) کے پاس زندگی میں پہلی دفعہ گیا اور ان سے اپنا مدعا بیان کیا کہ میں اپنا مضمون شائع کرانا چاہتا ہوں۔ خیال تھا کہ شاید وہ بھی وہی جواب دیں گے جو روزنامہ اسلام کے چیف ایڈیٹر نے دیا تھا لیکن میرا خیال غلط ثابت ہوا۔ سید معاویہ شاہ نے مضمون پڑھنے کے بعد پاس کر دیا اور اگلے ہی شمارے میں شائع بھی کر دیا۔

یہ مضمون پچھلے دنوں میں نے دوبارہ نکال کر اس نیت سے پڑھا کہ کہیں میں نے اس میں اپنے موجودہ موقف سے متضاد موقف تو اختیار نہیں کیا تھا۔ مطالعہ کے بعد متضاد ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں تو کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا تاہم اس مضمون میں بیان کیے گئے خیالات مجھے اسلام اور سائنس و ٹیکنالوجی سے متعلق موجودہ بحث سے مربوط محسوس ہوئے۔ چنانچہ اس پر نظر ثانی اور حک و اضافہ کے بعد مجھے یہ مضمون بالکل تازہ محسوس ہوا لہذا آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں۔ اگر آپ بھی اسے مفید اور البرہان کے صفحات کے قابل سمجھیں تو میرے لیے یہ باعث اعزاز ہوگا۔ اس طرح شاید سائنس و ٹیکنالوجی کے مقدمہ میں (صحیح یا غلط) میرا مکمل بیان (جو اس عاجز نے اپنے دینی مطالعے اور سوچ بچار کی روشنی میں مدون کیا) البرہان کے ذریعہ سے مباحثہ کے لیے سامنے آجائے گا۔ اس طرح سائنس مخالف سوچ کا محاکمہ، تنقید اور تجزیہ کرنے والوں کو فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی اور وہ اس ضمن میں کسی حتمی نتیجے پر پہنچ سکیں گے۔

والسلام،

محمد رشید (ملتان)

### ایمان اور ٹیکنالوجی

مسلمانوں کے زوال، افلاس اور تباہی و بربادی کے اسباب کی تشخیص اور تجزیہ کرتے ہوئے سب سے بڑا سبب اور سب سے بڑی وجہ ”علم“، یعنی سائنس و ٹیکنالوجی سے محرومی کو قرار دیا جاتا ہے۔ نہ صرف عوام بلکہ مسند علم و صحافت پر فائز بہت بڑے نام بھی مسلمانوں کی تباہی و بربادی اور ان پر ظلم و استحصال کا اصل اور بنیادی سبب ”علم“، یعنی جدید ٹیکنالوجی سے ان کا بے بہرہ ہونا ہی قرار دیتے ہیں۔

اگرچہ یہ بات کسی حد تک درست ہے کہ دنیا میں اس وقت مسلمانوں پر ظلم و ستم اور استحصال کا ایک سبب مسلمانوں کا ”سائنس و ٹیکنالوجی“ سے تہی دامن ہونا بھی ہے مگر یہ سبب ایسا نہیں ہے کہ اسے اصل، بنیادی اور مرکزی سبب قرار دیا جائے۔ اس کے برعکس پوری دنیا میں مسلمانوں کی ذلت و خواری اور تباہی و بربادی کی اصل وجہ اور بنیادی سبب ان کا ایمان و تقویٰ میں شدید غفلت، تساہل اور ضعف و اضمحلال کا شکار ہونا ہے۔ مسلمانوں کی اصل اور سب سے بڑی طاقت ”ایمان و تقویٰ“ ہے۔ اگر ایمان و تقویٰ ہے تو بڑے سے بڑا نقصان اور بڑی سے بڑی تباہی پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ بلکہ ایمان و تقویٰ کی حامل اور اس سے تمسک رکھنے والی مسلمان امت پر پڑنے والی بڑی سے بڑی مصیبت بھی (ایمان و تقویٰ کی عظیم نعمت کی وجہ سے) کسی بڑے فائدے اور رحمت میں بدل جاتی ہے۔ لیکن اگر مسلمان اپنی اس حقیقی اساس اور اپنے اس مرکز و محور اور نصب العین (ایمان و تقویٰ) سے شدید غافل اور لاپرواہ ہوں اور اس معاملے میں ضعف و اضمحلال، فساد اور بیماری کا شکار ہوں تو پھر علوم و فنون کی بڑی سے بڑی طاقت، سائنس اور ٹیکنالوجی کی مہیب سے مہیب قوت کے حصول کے باوجود ان کا تباہی و بربادی اور زوال و پستی سے بچنا محال اور ناممکن ہے۔

جنگی ساز و سامان، ٹیکنالوجی اور جدید ہتھیاروں کی حیثیت محض مادی وسائل کی ہے، جس کا فائدہ اور نقصان اس کے استعمال کرنے والے پر منحصر ہے کہ وہ اسے کس مقصد کے لیے استعمال کرتا ہے جبکہ ایمان و تقویٰ وہ قوت، حوصلہ، جرأت اور استقامت عطا کرتے ہیں کہ جس کے بغیر اس کا مثبت استعمال ناممکنات میں سے ہے۔ اور (چند نہایت قلیل استثناءات کو چھوڑ کر) ”ایمان و تقویٰ“ کے بغیر اس جنگی ساز و سامان اور ٹیکنالوجی کی حیثیت ایک نہایت شرانگیز طاقت اور فرعون قوت کی سی ہے۔ مسلمان اگر ایمان و تقویٰ سے عاری اور اس جدید ٹیکنالوجی سے مسلح ہو تو ایسی صورت میں اس کی مثال اس شخص کی سی ہوگی جو درخت پہ بیٹھا اسی شاخ کو کاٹ رہا ہو جس پر وہ بیٹھا ہو۔ گویا ایمان و تقویٰ سے عاری مسلمان اس جنگی ٹیکنالوجی اور سائنسی علوم کو الٹا امت کے نقصان اور فساد کے لیے استعمال کر بیٹھے گا۔

اگر صورت حال یہ ہو کہ مسلمان قوم یا مسلم حکمران ایمان و تقویٰ سے تو عاری ہوں (بے حیائی اور فحاشی کی دلدادہ قوم یا حکمران پوری قوت سے اپنے اندر فحاشی کو فروغ دے رہے ہوں) مگر جدید سائنسی علوم اور جنگی ٹیکنالوجی پر عبور حاصل ہو جبکہ مقابلے میں کفار بھی برابر کی جنگی ٹیکنالوجی اور قوت کے حامل ہوں تو دشمن کی فتح یقینی ہے۔ کیونکہ لڑائی اور جنگ کے لیے جس جرأت اور جذبہ کی ضرورت ہے وہ اسی صورت میں عطا ہو سکتا ہے جب مسلمان قوم نے اپنے اللہ کو ناراض نہ کیا ہو۔ اب جبکہ فحاشی و عریانی اور حرام کاری و حرام خوری پر فریفتہ ہونے کی وجہ سے مسلمان قوم اور مسلم حکمرانوں نے اپنے رب کو ناراض کر لیا ہے تو ان کے اندر بزدلی، بے ہمتی، بے غیرتی اور خوف کا پیدا ہونا یقینی بات ہے۔ جبکہ اس کے مقابلے میں دشمن چونکہ ہے ہی شیطان کا ساتھی تو شیطان ان کے اندر مسلمانوں کو مٹا دینے کا جذبہ اور جرأت پیدا کرتا رہتا ہے اور شیطان اپنے ساتھیوں کے ذریعے سے نام کے مسلمانوں کو، ان میں موجود بچے کچھے ایمان و تقویٰ کے حامل، حقیقی مسلمانوں سمیت صفحہ ہستی سے مٹا دینا چاہتا ہے۔ اس صورت میں مسلمانوں کا بربادی و تباہی سے بچنا محال نظر آتا ہے۔ ہاں اگر مسلمان قوم من حیث المجموعی اور مسلمان حکمران اللہ کے حضور توبہ کریں اور ایمان و تقویٰ پر مبنی اسلامی زندگی کو گزرنے کا فیصلہ کر لیں تو تباہی و بربادی کی یہ مصیبت ٹل سکتی ہے۔

اس ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ مسلمانوں کی قوت اور طاقت کا اصل منبع اور سرچشمہ ایمان اور تقویٰ ہے جبکہ سائنسی علوم اور جدید ٹیکنالوجی کی حیثیت محض ایک وسیلہ اور ذریعہ کی سی ہے۔ اہل ایمان کے لیے استطاعت بھر اعلیٰ سے اعلیٰ جنگی قوت اور جدید سے جدید جنگی ٹیکنالوجی کا حصول واجب اور فرض کے درجے میں ہے۔ مگر یہ اعلیٰ سے اعلیٰ اور جدید سے جدید جنگی ٹیکنالوجی اور سائنسی علوم اس وقت صفر بلکہ الثابتی و بربادی کا پیش خیمہ بن کر رہ جاتے ہیں جب مسلمان قوم اور ان کے حکمران ”ایمان“ کی مرکزی و محوری طاقت کو شدید کمزور کر کے اسے مسلسل نقصان پہنچا رہے ہوں اور تقویٰ و اطاعت چھوڑ کر بے حیائی، فحاشی اور سرکشی کی زندگی کے دلدادہ بن چکے ہوں۔ چاہے وہ عدالتی، سیاسی اور معاشی زندگی کا نظام قرآن و سنت کے قانونی نظام پر قائم کرنے کا دعویٰ ہی کیوں نہ کرتے ہوں اور چاہے ایسا ظاہری طور پر ہوتا نظر بھی آ رہا ہو۔ اندلس و بغداد کی ”اسلامی حکومتوں/خلافت“ کی بدترین تباہی و بربادی اس دعویٰ کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

لہذا ہر آن اور ہر لمحہ ہمیں اپنی مرکزی و محوری طاقت یعنی ”ایمان“ کو مضبوط سے مضبوط تر کرنا چاہیے۔ اپنے نصب العین یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا اور آخرت کی نجات سے شدید سے شدید تر تمسک کرنا چاہیے اور اپنے راہ عمل (یعنی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے خود بچنا اور دنیا سے اس سرکشی و فحاشی کو مٹانا) پر پوری قوت سے

ثابت قدم رہتے ہوئے، قوت رہب یعنی جدید سے جدید اور اعلیٰ سے اعلیٰ جنگی ٹیکنالوجی اور سائنسی علوم کی تحصیل کی کوشش جاری رکھنی چاہیے۔

اہل ایمان کی اصل مرکزی و محوری طاقت، ان کے اصل نصب العین اور راہ عمل (یعنی ایمان و تقویٰ) کے بغیر سائنسی علوم اور جنگی ٹیکنالوجی کی حیثیت محض اور محض ایک شیطانی قوت اور شر کے ساتھی کی سی ہے۔ اس صورت میں یہ چیز آگ کا الاؤ ہے نہ کہ کوئی منفعت بخش چیز۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے دانشور اور سوچنے سمجھنے والے طبقے کی ایک عظیم اکثریت امت کے عروج و زوال میں ایمان و تقویٰ کو اصل میزان اور اصل معیار ماننے کی بجائے ”سائنس اور ٹیکنالوجی“ کو اصل امام اور میزان کا مقام عطا کرنے پر مصر ہے۔

سادہ ذہنوں میں یہ سوال اس وقت زیادہ شدت سے اس لیے بھی پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا جب افغانستان میں ”ایمان و تقویٰ“ کے حامل طالبان (اور اسامہ) کی نوزائیدہ اسلامی حکومت کو امریکہ اور مشرق و مغرب کی شیطانی قوتوں نے ملیا میٹ کر کے رکھ دیا۔ اس وجہ سے اکثر سادہ اور بعض پیچیدہ ذہنوں میں افسوس، حسرت اور غم و دکھ کی کیفیت کے ساتھ یہ خیال شدت سے ابھرا کہ مسلمانوں کے زوال اور تباہی و بربادی کا اصل سبب علم و ٹیکنالوجی سے ان کی دوری ہے۔ اور یہ کہ مسلمان اس وقت پوری دنیا میں اسی وجہ سے ظلم و استحصا اور تباہی کا شکار ہو رہے ہیں کہ وہ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی سے محروم ہیں۔

تاہم اگر سنجیدگی سے اور گہرائی میں جا کر اس سوچ کا تجزیہ کیا جائے تو یہ سوچ محض سطحی اور ظاہری حالات پر اپنی تمام عمارت اٹھاتی نظر آتی ہے۔ ہم سوال کرتے ہیں کہ اگر افغانستان کے مسلمان ”شمالی اتحاد“ بنا کر غداری نہ کرتے اور دنیا بھر کی مسلمان حکومتیں مظلوم کا ساتھ چھوڑ کر ظالم امریکہ کی ہاں میں ہاں نہ ملاتیں تو کیا امریکہ کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ افغانستان کی نوزائیدہ اسلامی حکومت کو یوں ختم کر دیتا؟ اگر امت کے یہ غدار، خائن اور بدکردار لوگ پیٹھ میں چھرا گھونپنے اور نہتے و معصوم مسلمانوں کے سینے پر گولیاں برسانے سے باز آ جاتے تو کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ تورابورا جسے طالبان کی بربادی کی علامت بتایا جا رہا تھا، یہی تورابورا امریکہ کی اعلیٰ ترین جنگی و ایٹمی ٹیکنالوجی کا قبرستان بن جاتا۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ امت میں اگر خائن، بدکردار اور غدار لوگوں کی اکثریت نہ ہوتی تو افغانستان کے یہی پہاڑ امریکہ کی سپر طاقت اور اس کی اعلیٰ ترین ٹیکنالوجی کا مدفن ثابت ہوتے؟ کائنات کے مالک کا ازل سے فیصلہ ہے کہ ”فرعون“ کا مقدر ڈوبنا ہے۔ کچھ سال پہلے جب عراق اور افغانستان میں دنیا کا سب سے بڑا فرعون (امریکہ) اپنی ہولناک ٹیکنالوجی سے تباہی و بربادی کی نئی تاریخ رقم کر رہا تھا تو سائنس، ٹیکنالوجی

اور طاقت و قوت کی پرستش کی حد تک تعظیم کرنے والا طبقہ ان اہل ایمان کا مذاق اڑایا کرتا تھا جو عصر حاضر کے اس فرعون اعظم کا ڈوبنا مقدر سمجھتے تھے۔ لیکن اب اکیسویں صدی کے فرعون اعظم کے ڈوبنے اور غرق ہونے کا وقت اتنا قریب آگیا ہے کہ خود امریکیوں کو یہ صاف نظر آنے لگا ہے اور وہ چیخ چیخ کر اپنی غرقابی و مکمل بربادی سے بچنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ امریکہ کا جو ڈوبنا آج سے دس سال پہلے مقدر تھا، مسلمانوں میں سے غدار، منافق، بدکار اور آلہ کار حکمرانوں اور قوتوں کی غداری اور ایمان فروری کی نتیجے میں فرعون اعظم کو کچھ سال اور مل گئے۔ تاہم دیکھنے والے دیکھ رہے ہیں اور محسوس کرنے والے محسوس کر رہے ہیں کہ افغانستان کے پہاڑ، اور پہاڑ جیسا عزم اور حوصلہ رکھنے والے اہل ایمان عصر حاضر کے فرعون کی ہیبت ناک طاقت اور ٹیکنالوجی کا مدفن ثابت ہوں گے۔ بلکہ ہو چکے ہیں اور امریکہ و یورپ دم دبا کر افغانستان سے بھاگ رہے ہیں۔

جو لوگ سائنس اور ٹیکنالوجی ہی کو قوموں کے عروج و زوال میں کلیدی مقام عطا کرتے ہیں کیا ان کے پاس اس سوال کا کوئی جواب ہے کہ روس اپنی تمام تر سائنسی و علمی ترقی اور ٹیکنالوجی کے بام عروج پر پہنچنے کے باوجود کلڑے کلڑے کیوں ہو گیا؟

جدید دور کی ایک بہت بڑی مثال جاپان کی ہے۔ جاپان نے علم، تحقیق، سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں اعلیٰ ترین بلندیوں کو چھوا ہے مگر دفاعی نقطہ نظر سے اس کی حیثیت محض اور محض امریکہ کے ایک لے پالک کی سی ہے۔ اگر ”علم، سائنس اور ٹیکنالوجی“ ہی قوموں کو امامت دلانے میں حتمی حیثیت کی حامل ہوتی تو کیا جاپان اس وقت کم از کم ایشیاء کا امام نہ ہوتا؟ اور کیا امریکہ کے لیے یہ ممکن ہوتا کہ وہ جاپان سے اجازت لیے بغیر ایشیا میں کوئی بھی فوجی کارروائی کر سکتا؟ مگر حقائق تو یہ ہیں کہ اس وقت دنیا تو دور کی بات ہے ایشیا میں بھی (جہاں جاپان واقع ہے) قوموں کے نزاعات و اختلافات میں جاپان کو کوئی فیصلہ کن اور قابل وقعت حیثیت حاصل نہیں ہے بلکہ جاپان تو اپنے دفاع کے لیے بھی امریکہ کا محتاج ہے۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہ امن اور خوشحالی عطا کرتی ہے جس کی وجہ سے دنیا اس پر مری جا رہی ہے۔ مگر کوئی بتا سکتا ہے کہ دنیا میں اس وقت سائنس اور ٹیکنالوجی کا امام ہونے کا دعوے دار امریکہ بہادر کتنے ملکوں کو امن اور خوشحالی بانٹ چکا ہے اور کتنی قوموں کو امن اور خوشحالی عطا کر چکا ہے؟ اس سوال کا جواب نہایت تلخ ہے اور یہ کہ امریکہ دنیا کو امن اور خوشحالی تو کیا بانٹتا اس نے الٹا پوری دنیا میں فساد اور بربادی کے بیج بوئے ہیں اور اس پر تاریخ کے ناقابل تردید شواہد موجود ہیں۔ ہم دور نہیں جاتے خود امریکہ ہی کو دیکھ لیجیے کہ اس نے براعظم امریکہ کے نوکروں کے قریب اصل باشندوں کی نسل کشی کر کے اور انہیں بدترین تباہی کے کنارے لگانے کے بعد عروج حاصل کیا۔ پھر ایسا نہیں ہے کہ یہ



عروج حاصل کرنے کے بعد اس نے کوئی گھڑی سکون یا امن کی گزاری ہو..... بلکہ اس کے برعکس جو چیز آج ہم اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں وہ یہ کہ امریکہ خود اپنے شہریوں کو طرح طرح کے مصنوعی خطرات سے ڈراتا رہتا ہے۔ کبھی انٹرکس کے مصنوعی حملوں سے خوفزدہ کرتا ہے، تو کبھی القاعدہ کے ایٹمی اور تباہ کن حملوں سے ڈراتا رہتا ہے۔ کیا اسی چیز کا نام امن اور خوشحالی ہے اور کیا سائنس اور ٹیکنالوجی کے نقطہ عروج پر پہنچ جانے کا یہی نتیجہ ہے کہ ایک ان دیکھا خوف ہر وقت ستائے رکھے اور پوری دنیا کو جنگ اور دہشت کے عذاب میں مبتلا کر دیا جائے۔ خود امریکی دانشور بنگ دہل کہہ چکے ہیں کہ امریکہ اس وقت دنیا کا سب سے بڑا دہشت گرد ہے تو کوئی ہمیں بتائے کہ ہم امن اور خوشحالی کہاں تلاش کریں؟

حقیقت یہ ہے کہ اصل طاقت اور اصل قوت ایمان، تقویٰ اور اتباع رسول ﷺ میں پنہاں ہے۔ مسلمانوں کے قدم برابر فتح و ترقی کی طرف بڑھتے رہے جب تک وہ ایمان، تقویٰ اور اطاعت رسول ﷺ پر ثابت قدم رہے۔ اور اسی سے تمام دنیا کو امن اور خوشحالی ملی۔ لیکن جب ایمان، تقویٰ اور اطاعت رسول ﷺ میں زوال و خرابی کی عام روش چل پڑی تو تمام تر مادی و علمی ترقی اور جنگی ٹیکنالوجی پر مضبوط گرفت رکھنے کے باوجود مسلمان بغداد و اندلس میں تباہ و برباد کر دیے گئے۔ کوئی بتا سکتا ہے کہ آخر کیوں؟ کیا سائنسی، علمی اور ٹیکنالوجی کے لحاظ سے وہ اس وقت کے امام نہ تھے؟ اور پھر کیا وہ اللہ تعالیٰ کے ماننے والے نہ تھے؟ کیا وہ رسول اللہ ﷺ سے محبت کے دعویدار نہ تھے؟ کیا وہ اسلام و قرآن سے والہانہ عقیدت نہ رکھتے تھے؟ مگر اس تمام کے باوجود بربادی ان کا مقدر بن کر رہی..... کیوں؟ بات بالکل واضح ہے کہ ان کے ہاں ”ایمان و تقویٰ اور اتباع رسول ﷺ“ کی محض ظاہری غافلانہ رسمیں رہ گئیں تھیں جبکہ ان کا اصل اعتماد اور بھروسہ علمی و فنی ترقی اور مادی طاقت پر رہ گیا تھا۔ اور فحاشی حرام خوری، حرام کاری، عیش پسندی اور ظلم و ظالمانہ رویوں کی عام روش چل پڑی تھی تو ”علم و ٹیکنالوجی“ اور مادی طاقت و قوت کے امام ہونے کے باوجود اپنی عملی بے راہ روی اور ایمان و تقویٰ کی حقیقت کھودینے کی وجہ سے بغداد اور اندلس کی سپر پاور قوت کے حامل مسلمان خون خون کر دیے گئے۔ مکمل بربادی ان کا مقدر بن کر رہی۔

اس کے برعکس جب ہم صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو دیکھتے ہیں تو سائنس و ٹیکنالوجی سے بے بہرہ ہونے کے باوجود اپنے وقت کی سپر پاورز (روم و ایران) کی اعلیٰ ترین جنگی ٹیکنالوجی کی حامل قوتوں سے محض اور محض ایمان و تقویٰ اور اطاعت رسول ﷺ کی طاقت اور قوت کے بل بوتے پر ٹکرا گئے۔ اور یہ وہ مقام ہے جہاں انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ جہاں انسان کا اپنی آنکھوں پر سے اعتماد اٹھنے لگتا ہے کہ سائنس و ٹیکنالوجی کے لحاظ سے صفر اور مادی قوت کے لحاظ سے نہایت مفلوک الحال لوگ اپنے وقت کی سائنس و ٹیکنالوجی کی امام قوتوں اور سپر پاورز کو، جس نہس کر کے رکھ دیتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں

’ایمان و تقویٰ‘ اور سائنس و ٹیکنالوجی براہ راست آمنے سامنے برسرِ پیکار ہوتے ہیں۔ اور ایمان و تقویٰ سائنس و ٹیکنالوجی کو بدترین شکست دینے کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی برتری اور فوقیت کا اعلان کر دیتے ہیں۔ یہیں سے یہ فیصلہ ہو جاتا ہے کہ زندگی کی دوڑ میں اہل ایمان کے لیے سائنس و ٹیکنالوجی کو امام و میزبان کا مقام دینا تو دور کی بات ہے اسے ’ایمان و تقویٰ‘ کی برابری بھی حاصل نہیں۔ بلکہ ایمان و تقویٰ کو اگر اہل ایمان کی فکری و عملی زندگی میں امامت اور حکمرانی کا مقام حاصل ہے تو سائنس اور ٹیکنالوجی کو اس حکمران اور امام کے ادنیٰ غلام کی حیثیت حاصل ہے۔

ہماری اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ علم اور ٹیکنالوجی جب تک ’ایمان و تقویٰ‘ کی فرمانروائی اور حکمرانی کے تابع ترقی کرتی رہے اس وقت تک وہ ایک بہت فائدہ مند اور منفعت بخش چیز ہے مگر جب یہ ’ایمان‘ کی نگہبانی اور نگرانی سے آزاد ہو جائے تو یہی سائنس اور ٹیکنالوجی ایک مہلک اور مضرت رساں چیز اور انسانیت کے لیے ایک خطرہ بن جاتی ہے۔

لوٹ ایسی یہاں مچی ہے، کوئی شے بھی نہیں بچی ہے  
ضمیر غیرت حیا شرافت، جنازہ ہر شے کا جا رہا ہے  
کہاں کی خیرات کیسا صدقہ، نماز کیسی کہاں کا روزہ  
فرض جس پر ہے حج وہ ظالم، سیرِ لندن کو جا رہا ہے  
بچے بھوکے ہیں جاں بلب ہیں، جیب حاکم میں چھ ارب ہیں  
غریب روٹی کو تک رہا ہے، امیر مرغے اڑا رہا ہے  
شہر سے لاشے اُبل رہے ہیں، مکاں غریبوں کے جل رہے ہیں  
خوشی سے قاتل اچھل رہے ہیں، حکم اوپر سے آ رہا ہے  
کوچہ کوچہ مچی ہے ہلچل، گلی گلی میں بنے ہیں مقتل  
خونِ ناحق سے شہر جل تھل، نیرو بنی بجا رہا ہے

(مولانا ثناء احمد خاں فتنی)

## اسلامی معاشیات اور ادب - خطوط کے آئینے میں از ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی (مرتب)

اس کتاب کے ص ۳۹۷ تا ۴۲۶ پر صدیقی صاحب کا مضمون ”معاصر اسلامی فکر“ شامل ہے جو ۱۹۷۰ء میں لکھا گیا تھا اور جدیدیت کا شاہکار ہے۔ مولانا مودودیؒ نے اس مقالے کے باطن میں مستور جدیدیت پسند افکار کی گمراہی کے باعث اسے ترجمان القرآن میں شائع کرنے سے انکار کر دیا تھا اور جوابی خط میں لکھا تھا کہ ”یہاں تو اس کی اشاعت ممکن نہیں آپ چاہیں تو ہندوستان میں اسے شائع کر دیں کیوں کہ وہاں اس کی حیثیت محض علمی بحث کی سی ہوگی [خط نمبر ۲۸]۔“

نجات اللہ صدیقی صاحب کی جدیدیت ۱۹۶۲ء سے ہی ابھر رہی تھی لہذا اسی کتاب کے ص ۲۹ پر خط نمبر ۸ میں مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں کہ ”آپ کے نقطہ نظر کو میں اچھی طرح سمجھتا ہوں اور جس حد تک اپنی اخروی ذمہ داریوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے لبرل ازم برت سکتا ہوں برتا بھی ہوں لیکن پاکستان میں خصوصیت کے ساتھ حالات کو جس رخ پر جاتے دیکھ رہا ہوں اس کی بناء پر کوئی ایسی بات کرتے ہوئے میری روح کانپ جاتی ہے جو بے لگام اجتہادات کا دروازہ کھولنے کی ذمہ داری میں مجھے شریک کر دے۔ میرا خیال ہے کہ میری اس احتیاط کی روش سے جو نقصان ہو سکتا ہے اس سے بہت زیادہ نقصان یہ احتیاط ملحوظ نہ رکھنے سے ہو جائے گا۔ گاڑی بہت گہرے نشیب کی طرف جارہی ہے بریک ڈھیلا کرتے ہی سیدھی کھڈ میں جا گرے گی۔“

صدیقی صاحب کی جدیدیت پسندی کا علمی جائزہ جماعت اسلامی ہند کے رکن حاذق ضیائی سہرائی کے خط نمبر ۸۴ ص ۱۳۴ میں لیا گیا ہے۔ صدیقی صاحب کے نام لکھتے ہیں ”بالعموم جن لوگوں کا ابتدائی ذہنی سانچہ صرف تحریک اسلامی کے لٹریچر سے بنا ہے بعد میں انہوں نے اگر کچھ قرآن و حدیث کا درس بھی باضابطہ لیا تو اسلامیات پر پوری طرح، عارضی مدّت میں، قادر نہ ہونے کی حالت میں اگر کچھ اجتہادی کام بھی ہو تو وہ اجتہاد بالرأی سے بھی کم تر ہوگا اور بسا اوقات ایک بڑے خطرے کا باعث رہا۔ اللہ سے اس کے لیے پناہ مانگنا چاہیئے... آپ مسائل ہی کا حل چاہتے ہیں۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر آپ کی نظر صرف مسائل زندگی پر پڑ رہی ہے۔ آپ زندگی اور مسائل زندگی دونوں کے حقیقی فرق اور

ادغام کو صحیح طور پر نہیں سمجھ رہے۔“ اسلامی زندگی حدود شریعت میں ہی رہ کر پیدا ہوتی ہے اس میں فکر مطلق کی آزادی نہیں۔ اس آزادی کا نام اگر غلطی سے اجتہاد فی الدین رکھ بھی دیا جائے تو زندگی کی مقصدیت یعنی عبدیت فوت ہو جائے گی اور آدمی خدا پرستی سے دور جا پڑے گا۔ مگر یہ بتائیے کہ کیا واقعی ابھی تک آپ کی نظر میں سنت کا صحیح مفہوم متعین نہیں ہوا ہے؟ کیا پونے چودہ سو سال میں بھی یہ مسئلہ حل نہیں ہوا؟ آپ کا یہ فرمانا کہ قرآن و سنت کے منشاء کی تعیین میں جملہ انسانی اجتہادات و آراء قابل ترمیم ہو سکتی ہیں اور انسان صرف ان ہدایات کا پابند ہے جن کا اسے قرآن و سنت کی نصوص پابند کرتی ہوں مگر از سر نو ان نصوص کو سمجھنے کے لئے کس کا فہم معتبر ہوگا؟ ان ترامیم کے حدود کیا ہوں گے؟ یہ معیار آئمہ محدثین کا متعین کردہ ہوگا یا بالکل آزاد یا جملہ فقہائے کرام کی آراء سے متضاد..... آپ کے قلم سے اللہ تعالیٰ نے بہت سا کام لیا ہے اور نئے مباحث سامنے آئے ہیں۔ البتہ کبھی زعم علم میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان زلت قلم سے تحریف فی الدین میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اسے گاہے اس کا شعور بھی نہیں ہوتا۔“ —جماعت اسلامی ہند کے ایک رکن سید احمد ص ۱۷۴ پر خط نمبر ۱۱ میں صدیقی صاحب کو لکھتے ہیں کہ ”آپ اپنے مخصوص خیالات کے لیے کتاب و سنت اور اسلامی تعلیمات سے کوئی دلیل پیش نہیں کرتے، اللہ کی رضا پر چلنے کی تلقین کرتے ہیں لیکن دوسری طرف مختلف معاملات میں یہ نہیں بتاتے کہ اللہ کی مرضی اس معاملے میں کیا ہے؟ آپ اجتہاد پر جس انداز سے زور دے رہے ہیں اس سے انتشار فکر کے سوا کسی فائدے کی توقع نہیں ہے کیونکہ ماضی کے افکار و آراء سے اعتماد اٹھ جائے گا اور ہر شخص محض اپنی عقل کے سہارے اجتہاد کرے گا۔“

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی صاحب کا اصل مسئلہ وہ ہے جس کی طرف پروفیسر خورشید صاحب نے خط ۹۰ ص ۱۴۲ پر توجہ دلائی ہے ”میں خود اس بات کو شدت سے محسوس کر رہا ہوں کہ ہم علماء کی طرف بہت زیادہ جھک گئے ہیں اور اس میں انقلابیت اور آزادی کو بھی مجروح کر لیا ہے باقی رہا۔ مولوی حضرات کی طرف جھکاؤ تو میں خود اس کو صحیح نہیں سمجھتا اور یہاں آپ سے متفق ہوں۔ علماء سے یہ توجش ہی جدیدیت کی

خاص قسم ہے جسے انقلابی اسلامی بنیاد پرست جدیدیت کہا جاسکتا ہے اور جو محض نامعلوم کا خوف ہے۔ یہ خوف انفرادیت کے گم، ضم یا تحلیل ہو جانے کا خوف ہے اس کی کوئی حقیقی بنیادیں نہیں لہذا اس توحش، تامل، تذبذب، تردد، توقف کے باوجود جماعت اسلامی ہر جگہ بحیثیت مجموعی علماء کے ساتھ اور مدارس و مساجد کے ساتھ تعاون کا رویہ رکھتی ہے خصوصاً قاضی حسین احمد نے مختلف مسالک کے ساتھ مفاہمت کے لیے بہت اہم اور بنیادی کام کیا ہے۔ خورشید صاحب کی وحشت اپنی جگہ مکران کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی نجات اللہ صدیقی صاحب کی آزاد روی سے متفرقت تھے۔ اس سلسلے میں اسی کتاب میں ان کا وہ خط نہایت اہمیت کا حامل ہے جس میں وہ صدیقی صاحب کی جدیدیت سے اعلان برأت کرتے ہیں۔

عصر حاضر کی دینی تحریکیں تمام قوت مسائل حاضرہ کے حل پر خرچ کرتی ہیں لہذا ان کا رویہ نہایت اخلاص اور للہیت کے باوجود افادیت پرستی اور نتانجیت پرستی [Utilitarianism & Pragmatism] کے مغربی نظریات کی تقلید بن جاتا ہے گو کہ اس تقلید کا مقصد عوام میں دین کے غلبے اور نفاذ شریعت کے لیے اثر و رسوخ اور نفوذ ہوتا ہے تا کہ عوام انتخابی عمل میں ان کو منتخب کر سکیں لہذا الحاقی موضوعات اور عارضی مباحث ہی اسلامی تحریکوں کا مرکز نظر ہوتے ہیں۔ عوام کو اپنی جانب کسی بھی طرح راغب کرنے کی آرزو بلاشبہ دین کے غلبے کے لیے ہی ہوتی ہے لیکن اس آرزو کے غلبے کے نتیجے میں دین کا غلبہ محال ہو جاتا ہے۔ مصر سے لے کر پاکستان تک غلبہ، اقتدار اور سیاسی طاقت کے تجربے کے نتائج یکساں ہیں۔ ترکی کا تجربہ مختلف ہے مگر New Left لندن انہیں نیو اسلامسٹ (Nato Islamists) کہتا ہے اور ان کی اسلامیت کتنی بندشوں و مصلحتوں کے ساتھ ہے اس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ دین کے غلبے کا مطلب اقتدار اور قوت و شوکت نہیں روحانیت کا غلبہ ہے یعنی جب انقلاب کے مدعی کا وجود روحانی سانچے میں ڈھل جائے۔ اگر اسلامی قیادت اور غیر اسلامی یا سیکولر قیادت میں روحانی طور پر کوئی فرق محسوس نہ ہو تو پھر اسلامی انقلاب کی کیا ضرورت ہے؟ ایران کے صدر احمدی نژاد، ترکی کے وزیراعظم طیب اردگان اور امریکہ کے صدر اور فرانس کے وزیراعظم کے لباس، زبان، اسلوب، طرز زندگی، اخلاقیات، روحانیت اور لب و لہجے میں اگر کوئی فرق نہ ہو تو مشرق و مغرب کا بنیادی فرق کیسے آشکارا ہوگا؟ اگر مقابلے کی بنیاد صرف دنیا رہ جائے تو جس کے پاس دنیا سب سے زیادہ ہو، لوگ اس کی تقلید کیوں نہ کریں؟ اگر اسلام کے پاس مغرب کو متاثر کرنے کے لیے وہی کچھ ہے جو مغرب کے پاس پہلے سے موجود ہے تو مغرب اسلام سے کیوں کر متاثر ہوگا؟ ترقی، GDP میں اضافہ، اعلیٰ تعلیم اور سائنسی ترقی اگر ایران و ترکی کر لیں تو مغرب پر اس کا کیا اثر پڑے گا؟ یہ سب کچھ تو دونوں نے مغرب سے لیا ہے! ان کے پاس مغرب کو متاثر کرنے کی چیز تو دینی علمیت، روایت اور روحانیت ہے جس سے مغرب عاری ہے اور ہمارے

پاس اسی کی کمی ہے۔

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی صاحب کی جدیدیت پسندی ان کی دو کتابوں ”اسلامی نشاۃ ثانیہ کی راہ“ اور ”تحریک اسلامی عصر حاضر میں“ میں واضح طور پر سامنے آچکی تھی جس پر جماعت اسلامی ہند کے اکابرین عروج احمد قادری، سید احمد اور حاذق ضیاء سہرانی نے نہایت شائستہ نقد بھی کیا لیکن یہ تنقید صدیقی صاحب کی جدیدیت پسندی کے رجحان میں اضافے کا باعث بنی جس کا ثبوت ان کا مقالہ ”معاصر فکرو اسلامی“ ہے جسے مولانا مودودیؒ نے پاکستان میں شائع کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ مقالہ خرم جاہ مراد مرحوم کی زیر ادارت ”ترجمان القرآن“ میں پچیس سال کے بعد شائع ہو سکا اور اس مقالے کا تتمہ صدیقی صاحب کی تازہ کتاب ”مقاصد شریعت“ ہے جو ادارہ تحقیقات اسلامی پاکستان اور جماعت اسلامی ہند نے بھی شائع کی ہے۔ حیرت انگیز امر یہ ہے کہ نجات اللہ صدیقی صاحب کی جدیدیت جماعت اسلامی کے اندرونی حلقے حتیٰ کہ محترم پروفیسر خورشید احمد اور مولانا مودودیؒ تک محسوس کر رہے تھے لیکن وہ مقالہ جسے مولانا مودودیؒ نے شائع کرنے سے معذرت کی جب صدیقی صاحب نے حضرت والا ابوالحسن علی ندویؒ کو مطالعے اور تبصرے کے لیے ارسال کیا تو انھوں نے اس کا بھرپور خیر مقدم کیا اور تحسین آمیز کلمات لکھے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مغرب اور اس کے فلسفے اور اس کے مقاصد و اہداف پر علی میاں کی نظر بہت گہری نہیں تھی لہذا وہ صدیقی صاحب کے مقالے کے بین السطور میں سموئی گئی مغربیت کے فہم سے قاصر رہے۔ صدیقی صاحب کے نام لکھے گئے خطوط میں خود علی میاں مقالے کی تعریف کرتے ہوئے خط ۳۶ صفحہ ۵۸ پر لکھتے ہیں ”آپ کی تحریر سے استفادہ کیا اور اس کے بہت سے حصوں سے اتفاق ہے میری عربی کتاب النبوة والانبياء فی ضوء القرآن اور الارکان الاربعہ میں سوچنے کا طریقہ سامنے آ گیا ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ علی میاں کی دونوں کتابیں فہم دین اور دین کو برتنے کا جو سلیقہ، طریقہ، قرینہ پیش کرتی ہیں وہ ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی صاحب کے پیش کردہ فکری مغالطوں سے یکسر مختلف ہے۔ یقیناً علی میاں کو اس کا قوی احساس ہے لہذا انھوں نے اپنے مزاج کے مطابق سخت نقد کی بجائے ان کتابوں کے مطالعے کی طرف اُن کی توجہ مبذول کرائی اور یہ بھی ہدایت فرمائی کہ ”میراجی چاہتا ہے کہ آپ قرآن مجید اور سیرت نبوی سے براہ راست ان کا حل طلب کریں اور ان کے قلب و جگر میں اترنے کی کوشش کریں“ [ص ۵۸]۔ صدیقی صاحب کے مقالے میں اٹھائے گئے سوالات یا مغالطوں کے بارے میں علی میاں خط نمبر ۳ ص ۵۸ پر لکھتے ہیں ”آپ نے بڑے اہم سوالات اٹھائے ہیں جن کو زیادہ دنوں تک نظر انداز نہیں کیا جاسکتا لیکن سوال یہ ہے کہ ان مسائل پر کون غور کرے؟ یا تو وہ لوگ ہیں جو اس کے اہل نہیں اور جو اہل ہیں ان کو ترکی کے پچھلے دور کے علماء کی طرح اپنی دوسری

مصرفیتوں سے فرصت نہیں۔ مجلس تحقیقات شرعیہ کا قیام اسی سلسلے کی ایک ناچیز کوشش تھی مگر اس کو ابھی تک کوئی موزوں آدمی نہ ملا (۱۹۷۰ء کا یہ خط بتا رہا ہے کہ عالم اسلام کی علمی حالت کیا ہے؟) ہمارے صاحب ثروت طبقے کو نہ اس کی سمجھ ہے نہ توفیق۔ جو نوجوان فاضل اس کی اہلیت رکھتے ہیں اور قدیم و جدید پران کی ایک حد تک نظر ہے ان کو معاشی حیثیت سے بے فکر اور اس کام کے لئے فارغ کر دیں (گو یا اصل مسئلہ معاشی ہے جب تک معاشی فراغت میسر نہ ہو دین کا کوئی کام ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ بھی عصر حاضر کا ایک مرض ہے)۔ نجات اللہ صدیقی صاحب امت کے مسائل کا حل صرف معاشی فلاح اور سماجی ترقی میں ڈھونڈتے ہیں۔ آخر اس اسلامی طرز فکر اور مارکس کے طرز فکر میں کس نوعیت کا فرق ہے؟ دین کے نام پر دنیا بھر کے لوگوں نے اربوں کھربوں روپے دیے ہیں۔ عالی شان مساجد، عالی شان مدارس اور ان کے انتظام انصرام کو دیکھا جائے تو امت سے یہ شکوہ کہ وہ دین کے لئے دولت خرچ نہیں کرتی شکوہ بے جا ہے۔ مسئلہ روپے پیسے کا نہیں ہے اس یقین کا ہے جو بدل گیا ہے۔ عموماً ہم سب یہ سمجھتے ہیں کہ مغرب کا مقابلہ صرف مغرب کے طریقوں سے ہی ممکن ہے اور مغرب نے جو کچھ اس مادی دنیا میں کر کے دکھا دیا اس کی تقلید کے بغیر چارہ نہیں ہے لہذا ان کی روش کی پیروی کے بغیر امت کی نجات و عروج کا کوئی طریقہ صدیقی صاحب جیسے جدیدیت پسند مخلص مصلحین کی عقل کو قبول نہیں ہوتا۔ صدیقی صاحب آزاد خیالی کے لیے اجتہاد کے بجائے کوئی اور کام کرتے مثلاً وہ رسالت مآب کی یہ حدیث پڑھتے اور رک جاتے قال: قلت یا رسول اللہ! ان نزل بنا امر لیس فیہ بیان امر ولا نہی فما تامرنی؟ قال: شاؤروا فیہ الفقہاء العابدین ولا تمضوا فیہ رأی خاصۃ (مجمع الزوائد ۱/۷۸ وغیرہ)

وہ دین میں حکمت کے مقام سے واقف ہوتے تو مولانا مودودیؒ کے اس مشورے کو قبول کرتے جو ان کے مضمون ”معاصر فکر اسلامی“ کے بارے میں دیا گیا تھا۔ وہ حکمت کے اس بنیادی اصول سے بے بہرہ رہے کہ کسی بڑے شر سے بچنے کے لئے بعض حلال، مباح درست چیزیں بھی ترک کی جاسکتی ہیں جس طرح رسالت مآب ﷺ نے کعبہ کو اصل ابراہیمی بنیاد کے مطابق از سر نو تعمیر کرنے سے اجتراز فرمایا اور حضرت عائشہؓ کے استفسار پر جواب دیا کہ فقال لولا حدیثان قو مک بالکفر لفعلت [ابوداؤد] جب تک قابل اعتراض باتوں سے بچنے کے لئے ناقابل اعتراض باتوں کو بھی ترک نہ کر دے انسان متقی کا درجہ اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتا [ترمذی]۔

Inner of back Title

back Title



















































































































































